نظم آزاد

جو

حُسن و عشق کی قید سے آزاد ہے

از

شمس العلماء مولانا مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم

سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور

جسے

آغا محمد باقر صاحب نبیرہ حضرت آزاد نے

برائے

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور چھپوایا

قیمت ۱۲/

بار نہم — باہتمام حافظ محمد عالم مطبع عالمگیر پریس لاہور میں چھپا

۱۸۹۱ء

دیباچہ

یہ راز سب پر ظاہر ہے کہ ہماری زبان جس کو اُردو کہتے ہیں۔ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کے ملاپ کا پھل ہے۔ یہ نئی ایجاد ضرورت کے گھر میں پیدا ہوئی۔ روزمرّہ کاروبار کی ماں نے پیٹ میں رکھا۔ لشکر کے بازاروں میں بچپن گذرا۔ لڑکپن تھا کہ کھیل کود نے شاہجہان بادشاہ کے قلعہ میں پہنچا دیا۔

یہ ہونہار بچہ ایسی باتیں بناتا تھا کہ دیسی پردیسی سب کے دلوں کو بھاتا تھا۔ اور اپنے ننھے ننھے جملوں سے ہر امیر غریب کا مطلب ادا کرتا تھا۔ ذرا ہوش سنبھالا تو بازارِ حُسن میں ترچھی نگاہیں لڑانے لگا۔ شعرا کہ ازل سے تیرِ عشق کے زخم خوردہ تھے۔ اُن کو یہ ادا بہت پسند آئی۔ جھٹ گود میں اُٹھا لیا۔ اور اپنے دل کی باتیں گل و بلبل کے افسانے اُسی کے مُنہ سے کہلوانے لگے۔

شہنشاہِ ہند محمد شاہ جن کی عشق بازی وہ ہوسنا کی قیامت تک عبرت کا مرقع رہے گی ان کو اس کی نازک ادائی ہزار جان سے پسند آئی اور اس کو اپنی مصاحبت خاص کا درجہ عنایت فرمایا۔

یہ لڑکا ہی گلریز و عنبر بیز صحبتوں میں جوان اور جوان سے نوجوان ہوا۔

گئیں جہاں کی آب و ہوا کچھ موافق نہ پڑی بلکہ ہر وقت کی [illegible] نے مزاج
میں کچھ ایسی وارفتگی پیدا کر دی تھی کہ ہر وقت کسی [illegible] عشق
میں مجذوبانہ حال سے لیٹ [illegible] رہنے لگا۔ اور اگر کوئی شخص [illegible]
تو حسرت و یاس غم و الم سوز و غم کی ایک [illegible]
[illegible] پست ہو جاتے اور دل ٹوٹتے جاتے مجبوراً [illegible]
خدا کی قدرت [illegible] کہ دو ماہ بعد [illegible]
بازار نکلنے آنے [illegible] اور ایک ترجمان کی [illegible]
[illegible] کا انتخاب [illegible] سب انہیں میں ہو گیا۔ [illegible]
نوجوان سے اور کوئی اس کا اہل نظر نہ آیا۔

بمشکل انہوں نے اس لڑکے کو منایا۔ [illegible]
اس عاشق مزاج کو قابو میں لائے۔ اول اسکو [illegible]
بازار میں لین دین پر لگایا۔ پھر دفتروں میں لئے پھرے۔ [illegible] کی حالت [illegible]
جہاں کہیں چار ہم مشرب نظر آجاتے اور [illegible] بات [illegible]
اور یہی آشفتہ مزاجیاں اور وارفتگیاں سب کی [illegible]

اب اس نوجوان نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ گذر اوقات کے لئے تو انگریزوں
کے دفتروں میں دن گذارنا اور لطف [illegible] کے لئے [illegible]
[illegible] اور مغلوں کے درباروں میں راتیں بسر کرنا [illegible]

ک آیا تھا کہ زمانے نے ایک ورق اور الٹا مغلوں نے سلطنت کا کوہ نور ہیرا اپنی بے اعتدالیوں کے باعث انگریزوں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔

پھر کیا تھا۔ بدامنی کی آندھیاں آئیں۔ آشوب کے مینہ برسے خون کی ندیاں بہ گئیں۔ ہزاروں بنے بنائے لاکھ کے گھر خاک ہو گئے۔ اور وہ عشرت کدے درس عبرت دینے لگے۔ اور ہندوستان میں کسی کو سر چھپانے کا ہوش نہ رہا۔ مگر اس نوجوان کو انگریزوں نے دفتروں اور شرفا نے گھروں میں پناہ دی۔ جب امن و امان کا حکم عام ہوا تو پھر اردو کا نشہ زور جوان، دلبستگیاں ڈھونڈنے لگا۔ مگر اب سوائے حسرت و یاس کے اور کچھ باقی نہ رہا تھا۔ یہ اسی کے مرثیے پڑھنے لگا اور ایسے درد انگیز قصے سناتا کہ بھلے چنگے دل بیٹھ جاتے اور کام پہ دل نہ لگتا تھا۔ غرضیکہ الٹا وبال جان ہو گیا۔

یہ زمانہ ہندوستانیوں کے لئے عجیب زمانہ تھا۔ اب یہ حاکم نہ تھے بلکہ محکوم اور محکوم بھی ایسی قوم کے جو ظاہر میں ہم جیسے آدمی مگر حقیقت میں کام کرنے کی مشین تھے جنہوں نے علم و فلسفہ، سائنس، حکمت کو اپنا دست نگر نہیں بلکہ غلام بنا لیا تھا۔ ایسی میں وہی افراد ان کا ساتھ دے سکتے تھے جو ان جیسی ہمت اور ولولے رکھتے ہوں، ورنہ قدم بھی نہ ہل سکتے تھے۔ مگر یہ ولولے فرداً فرداً پیدا ہونے ناممکن تھے۔ یہ قومی جوش و خروش کے محتاج ہیں۔ اور جب تک قوم کو نہ جگایا جاتے یہ نعمت محال ہے۔

اب دشواری اور مشکل یہ درپیش تھی کہ ہندوستان کو کون جگائے اور جگائے تو

کس زبان میں قومی ترانہ بلند کرے کہ خدا نے اس اُجڑے دیار جس کو دلّی کہتے ہیں
وہاں کے ایک خانماں برباد مردِ خدا کو پنجاب میں ہماری زبان کا مجدد بنا کر بھیجدیا
اُسنے وہ عشرتکدے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ زبان مذکور کی عہد بعہد ترقیاں اس
کے سامنے پرورش پا چکی تھیں۔ اس انقلاب سے پہلے بھی وہ اور اس کا خاندان اُردو
کی خدمت کو ملک کیلئے واجب جانتا تھا اسکے والدین نے اسکا نام محمد حسین رکھا تھا اور
اُردو کے معمار حضرت ذوق نے آزاد کا معزز تخلص عنایت فرما کر اسکو زبان مذکور کا مجدد بنایا تھا۔
حضرت آزاد نے پہلے تو اُردو کی نثر کی داغ بیل ڈالی اور اسمیں ایسی راہ نکالی کہ
سبحان اللہ پھر اسپر ایسی عبارت آرائی کی کہ اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ مگر قوم کو جگانے اور اُٹھانے
کیلئے نثر کا کھیل کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ وہاں نظم کے جادو کی ضرورت تھی۔ تو
اس جادوکار نے اسی اُردو کے نئے نوجوان کو للکارا۔ وہ اس دولت سے خالی تھا
اُسکے خزانے پر حُسن و عشق کا خزانچی قبضہ کئے بیٹھا تھا۔ مگر مولانا نے ہمت کے پر لگائے۔
یورپ کی زندہ قوموں کے افسوں مانگے۔ تاریخ کے پھول اس میں سجائے حُسن و عشق
کے خزانچی سے الفاظ لئے اور نظم اُردو میں اس جگمگاتے مینار کی بنیاد رکھی۔
سنہ ۱۸۷۴ء تھا کہ نظم اُردو میں انقلاب آیا۔ لاہور میں ایک مشاعرہ کی بنیاد ڈالی
اور اس میں یہ گلدستہ قوم کے سامنے پیش کیا۔ کچھ ہمخیال احباب نے اسکو سنبھالا کچھ حکام وقت
نے اپنی نگہداشت کی اور یہ بڑھنے لگا۔ ابھی پودا بھی نہ بننے پایا تھا کہ پُرانے دقیانوسی
حُسن و عشق سے ازکار رفتہ گل و بلبل کے مرثیے ہاتھوں میں سنبھالے اسکی مخالفت کے

لئے نکل کھڑے ہوئے اس خیال کے سادہ لوح بزرگ جہاں تھے تڑپ گئے اور متفق ہو کر اس نوخیز پودے کے اکھاڑنے کے درپے ہو گئے۔

اب کیا تھا۔ ہر طرف سے ملامت کے تیر آنے لگے کہ ہائے ہائے یہ شخص ہماری شاعری کو خاک میں ملائے دیتا ہے اور ہمارے بزرگوں نے جو چیز سلطنتیں اور حکومتیں کھو کر حاصل کی تھی اس کو یوں برباد کرتا ہے۔ افسوس اُن حضرات کی آنکھوں پر ندامت کی پٹی بندھی ہوئی تھی اور لکیر کے فقیر ہو کر گھر بیٹھے کمبل میں مست ہو رہے تھے۔ کاش وہ ذرا غور سے اس گلکاری کو دیکھتے تو انہیں اس میں میر کا درد سودا کا زور کلام۔ آتش کی آتش بیانی۔ ذوق کی سادگی اور محاورہ بندی میر حسن کی روانی سب کچھ نظر آ جاتا۔ مگر ہاں اتنا فرق ضرور تھا کہ ان بزرگوں نے فقط زبان اور کی پرورش کی۔ اور اپنی دل لگی اور دل بستگی کا سامان فراہم کیا۔ اور حضرت آزاد نے اسی سرمایہ سے نظم اردو کا نیا مینار بنایا۔ اس میں قومی جوش و خروش اور ہمت کے ولولوں کا چراغ روشن کیا کہ اسکی روشنی اور چاندنی میں پستی کے رہنے والوں کو اور قوموں کی کوششیں اور ہمتیں صاف آئینہ ہو جائیں اور ان میں بھی اپنے لئے اخلاق حسنہ اور قوم کے لئے بہبودی کا سرمایہ جمع کرنے کی اُمنگ پیدا ہو۔

اس دن کون کہہ سکتا تھا کہ وہ پودا ایک دن اس قدر گھنا درخت بن جائیگا اور وہی تیر ملامت اسکی شاخیں اور پھل پتے بن کر لہرانے لگائیں گے اور انہیں ملامت کرنے والوں کی اولاد کو اس کی روشنی سے فیض پہنچے گا۔ اور ڈاکٹر اقبال ظفر علیخاں وغیرہ اور ہزاروں قومی درد رکھنے والے شاعر پیدا ہو جائینگے۔

یہ نظم اردو میں اس قدر عظیم الشان کارنامہ ہے جو قیامت تک سینے کے حرفوں سے لکھا جائے گا اور یاد رکھا جائے گا، جب تک نظم آزاد باقی ہے یہ قوم کے بچوں کے دلوں کو گرماتی رہے گی۔ ہر نظم ایک کتاب ہے۔ ایک سبق ہے۔ ایک رستہ ہے۔ بلکہ ایک دیا ہے جو سب چلنے والوں کو راستہ دکھاتا ہے۔ بعض جگہ بحر کی مجبوری اور زبان کی کم مائیگی کی وجہ سے آج ہم کو کچھ الفاظ بوجھل بھی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر دوستو! خیال تو کرو کہ جہاں سے ہم نے شروع کیا نقش عشق اول تھا۔ یا یہ کامیاب تھا۔ اس پر غور نہ کرو بلکہ اس وقت سے پہل کھاؤ اور اس کی کھٹائیوں سے اور پودے لگاؤ۔ آج دنیا بھر کے وسائل تمہاری خدمت کو ہاتھ باندھے حاضر ہیں۔ ان سے مدد لو۔ پیوند کرو۔ اور دیکھو کیا سے کیا ہوتا ہے۔

یہ نظمیں پانچویں بار ۱۹۰۷ء میں والد مرحوم نے دردمند احباب کی فرمائش سے جمع کیں اور چھپوائیں۔ اس وقت قوم کو اس طرف بہت کم خیال تھا۔ ایک عرصہ دراز میں وہ ختم ہوئیں۔ اس کے بعد ۱۹۱۰ء میں مولینا کے انتقال کے بعد ملکی ضرورتوں نے اہل ملک کو قومی اصلاح کی طرف زیادہ متوجہ کر دیا تھا۔ والد مرحوم نے دوبارہ چھپوائیں۔ اور ان میں غزلیات، قصائد، متفرق اشعار جو مل سکے شامل کر دیے۔ یہ کثیر التعداد ایڈیشن بہت مرغوب اور مطلوب ہوا۔ اب تیسرے ایڈیشن کے چھپوانے کا فخر قدرت نے میرے نام پر لکھ دیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اس عزت سے سرفراز ہوتا ہوں۔ میں نے نظم آزاد علیحدہ کر دی ہے۔

"حسن و عشق کی قید سے آزاد" کا خوبصورت جملہ اس کے زیب سرورق ہے۔
دوسرے اب تمام ہندوستان میں یہ کتاب نوجوان طالب علموں کے ہاتھوں
میں اور ہاتھوں سے کانوں اور آنکھوں کے راستے دلوں میں اُترتی ہے۔ لہٰذا میں
نے غزلیات وغیرہ علیحدہ دوسرے حصّہ کے لئے رکھ لی ہیں۔ انشاء اللہ زندہ رہا
تو اور غیر مطبوعہ غزلیات، قصائد، مرثیے، سلام، رباعیات شامل کرکے اسکو چھپوا دُونگا۔
اس دفعہ اس کا سائز بھی بدل دیا ہے اس میں بھی طالب علموں کی سہولت ملحوظِ نظر ہے۔
اب خُدا سے دعا مانگتا ہوں کہ مجھ ناچیز عبد خلیل کے اہتمام اور سعی سے
چھپی ہوئی نظمِ آزاد کو قبولیت کا خلعت عنایت فرما۔ اور جو مقصد مولانا ممدوح
کا تھا۔ اُسے پُورا کرکے ہمارے ملک کے نوجوانوں کو اپنے پیارے ملک کا جاں نثار
اور سچّا وفادار بنا اور شرافت حقیقی کے وہ جوہر عطا فرما جو ہمارے بزرگوں کے
لئے تمغۂ امتیاز تھے اور ہم کو مخلص اور ایثار مجسم بنا دے۔

آمین یا رب العالمین

دعا کا محتاج

طاہر نبیرہ آزاد

۱۵- مارچ
۱۹۲۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظم اور کلامِ موزوں کے باب میں خیالات

فلاسفۂ یونان کا قول ہے کہ دُنیا میں دو چیزیں نہایت عجیب و حیرت انگیز ہیں۔ اوّل نبضِ انسانی کہ بے گویائی حالِ باطن کا بیان کرتی ہے۔ دوم شعر کہ انہیں الفاظ کے پس و پیش سے کلام میں موزونیت اور اس سے ایک تاثیر عجیب دل پر پیدا ہوتی ہے۔ کتابوں میں اکثر شعر کے معنی کلام موزوں و مقفّیٰ لکھے ہیں۔ لیکن درحقیقت چاہیئے کہ وہ کلام موثر بھی ہو۔ ایسا کہ مضمون اس کا سُننے والے کے دل پر اثر کرے اگر کوئی کلام منظوم تو ہو لیکن اثر سے خالی ہو تو وہ ایک ایسا کھانا ہے کہ جس میں کوئی مزا نہیں، نہ کھٹّا نہ میٹھا۔ جیسا کہ شعر کسی اُستاد کا ہے ؎

دندانِ تو جملہ در دہانند　　چشمانِ تو زیرِ ابرو انند

جب انسان کے دل میں قوّتِ گویائی اور جوششِ مضمون مجتمع ہوتے ہیں تو طبیعت سے خود بخود کلامِ موزوں پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قدر

یہی توت اور ایسی قوت کا جوش و خروش زیادہ ہو گا۔ اسی قدر کلام بہ
ہوگا۔ روئے زمین پر پہلا غم ہابیل کا تھا۔ کہ قابیل کے سبب سے حضرت
کے دل پر طاری ہوا۔ اُسے نتیجہ جوشِ غم کا سمجھنا چاہیئے۔ کہ باوجودیکہ اسو
تک شعر و شاعری کا نام نہ تھا۔ مگر جوشِ طبیعت سے جو کچھ کلام اُن
اُن کی زبان سے نکلا۔ موزوں تھا۔ چنانچہ وہ سریانی میں اب تک موجود
ہے۔ جبکہ اصل کلام موزوں کی حضرت آدمؑ سے ہوئی تو فرزندِ رشید
موزوں طبع ہے کہ جو باپ کی میراث سے بہرہ ور ہو۔ اس میں شک نہ
کہ آدمی اور حیوان میں فرق گویائی کا ہے۔ پس قوتِ انسانی بھی اسی
کامل سمجھنی چاہیئے۔ جس میں قوتِ گویائی کامل ہو۔ چونکہ نظم بہ نسبت نثر
زیادہ تر زورِ طبیعت سے نکلتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ بہ نسبت نثر
موثر بھی زیادہ ہوتی ہے۔ کوئی مضمون، کوئی مطلب، کوئی خیال جو انسان
کے دل میں آئے یا مخاطب کو سمجھانا چاہیے تو تکلم سے نقشِ مدعا کو
نظر میں لاتا ہے۔ تاکہ ظاہر ہو۔ پس شاعر گویا ایک مصور ہے لیکن
مصور کہ خر و اشتر۔ درخت اور پتھر کی تصویر کاغذ پر کھینچے۔ بلکہ وہ ایسا
ہے کہ معنی کی تصویر صفحۂ دل پر کھینچتا ہے اور بسا اوقات اپنی رنگینیِ فصاحت
سے عکس نقش کو اصل سے بھی زیادہ زیبائش دیتا ہے۔ وہ اشیا جن کی نہ
مصور سے نہ کھنچے، یہ زبان سے کھینچ دیتا ہے۔ چنانچہ ہزاروں صفحہ ک

بھاگ کر فنا ہو گئے۔ مگر چند ہا سال سے آج تک اُن کی تصویریں پھرتی ہیں۔ کبھی تصورِ چشم حسرت دل پر کھینچتا ہے۔ کبھی صفائی فرصت و عیش سے طبیعت کی تنزار کرتا ہے۔ انہوں نے مرتبہ کہ جب چاہتا ہے ہنسا دیتا ہے۔ جب چاہتا ہے رُلا دیتا ہے۔ اہلِ عرب ہر کہانے قتل میں جنگ کرتے تھے۔ سلاطین ہند کے ہاں تو جنگ میں ... جاتے تھے کہ ... کہتے تھے کہ لوگ اپنی جانیں دشمن کے منہ میں جھونک دیتے تھے۔ اور اب تک یہ حالت ہے کہ جب سنتے ہیں بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سکندر اعظم کتاب ہومر کو بکف رکھتا تھا۔ اور سوتے میں بھی سرہانے رکھتا تھا۔ شاعر اگر چاہے تو امورات عادیہ کو بھی بالکل نیا کر دکھاتا ہے۔ پتھر کو گویا کر دے۔ درختان پا در گِل کو روان کر دکھاتا ہے۔ ماضی کو حال۔ حال کو استقبال کر دے۔ زمین کو آسمان، خاک کو طلا، اندھیرے کو اُجالا کر دے۔ اگر غور کر کے دیکھو تو اکسیر اور پارس اسی کو کہنا چاہیے۔ کہ جسے چھو جاتے سونا ہو جاتے۔ زمین اور آسمان اور دونوں جہان شعر کے دو مصرعوں میں ہیں۔ ترازو اسی شاعر کے ہاتھ میں ہے۔ جدھر چاہے جھکا دے۔

نظم در حقیقت ایک شاخِ گل ریز فصاحت کی ہے۔ جس طرح پھولوں کے رنگ و بو سے دماغ جسمانی تر و تازہ ہوتا ہے شعر سے رُوح تر و تازہ ہوتی ہے۔ پھولوں کی بو سے مختلف خوشبوئیاں محسوسِ دماغ ہوتی ہیں۔ کسی کی بو میں

نفاست و لطافت سے کیسی ہی سہانا ہو۔ اسی طرح مضامین اشعار کا بھی حال ہے جس طرح پھول کہ کبھی چمن میں، کبھی ہار میں، کبھی عطر کھینچ کر کبھی عرق میں جا کر، کبھی دور سے، کبھی پاس سے مختلف کیفیتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح مضامینِ شعری مختلف حالتوں اور مختلف عبارتوں میں رنگا رنگ کی کیفیتیں عیاں کرتے ہیں۔

عالمِ جسمانی میں انسان کے لئے غذا مادۂ حیات ہے اسی طرح عالمِ معنے میں روح کے لئے غذا درکار ہے۔ چونکہ اشعار و مضامین لطیف سے روح قوتِ کمال اور طاقتِ بلند پروازی پاتی ہے۔ یہی اس کی غذا ہے۔ روح کی لطافت و نفاست تو خود ظاہر ہے کہ وہ خاص روح القدس کے آفتابِ قدرت کا پرتو ہے۔ اسی سے شعر کے جوہرِ لطافت کو خیال کرنا چاہیئے کہ نفاست میں کس مرتبۂ عالی پر ہوگا۔ شاعر کو ایک نسبتِ خاص عالمِ بالا سے ہے۔ کہ بے وساطت اور بے اسبابِ ظاہری کے اُدھر سے اپنا سلسلہ جاری کرتا ہے۔ فی الحقیقت شعر ایک پرتو روح القدس کا اور فیضان رحمت الٰہی کا ہے۔ کہ اہلِ دل کی طبیعت پر نزول کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ظاہرا اپنے کلبۂ احزان میں پڑا رہتا ہے۔ مگر تمام عالم میں اس طرح حکومت کرتا ہے۔ جیسے کوئی صاحب خانہ اپنے گھر میں پھرتا ہے/ پانی میں مچھلی اور آگ میں سمندر ہو جاتا ہے۔ ہوا میں طائر بلکہ آسمان پر فرشتہ کی طرح نکل جاتا

ہے۔ جہاں کے مضامین چاہتا ہے، بے تکلف لیتا ہے۔ اور بہ تصرفِ مالکانہ اپنے کام میں لاتا ہے۔ زہے سعادت اس کی جسے ایسے ملکِ معنی کی سلطنت نصیب ہو۔ شعر گلزارِ فصاحت کا پھول ہے۔ گلہائے الفاظ کی خوشبو ہے۔ روشنی عبارت کا پرتو ہے۔ علم کا عطر ہے۔ قوائے روحانی کا جوہر، تاثیر معنوی کا ست ہے۔ روح کے لئے آبِ حیات ہے۔ گردِ غم کو دل سے دھوتا ہے۔ طبیعت کو بہلاتا ہے۔ خیال کو عروج دیتا ہے۔ دل کو استغنا اور بے نیازی، اور ذہن کو قوتِ پرواز دیتا ہے۔ گردِ افکار سے دامنِ دل کو بلند رکھتا ہے۔ تنہائی میں دل لگی پیدا کرتا ہے۔ وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت سفر در وطن اور سیر در چمن کے یہی معنی ہیں۔ اگرچہ شاعر ہمیشہ فکر و تردّد میں غرق رہتا ہے لیکن ایک شعر کہہ کر جیسی اس کے دل کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔ بادشاہ کو تسخیرِ ہفت کشور سے نہیں ہوتی۔ دل ... سنہ و گداز اور طبیعت ... ایسی قبولیت اثر کی پیدا کرتا ہے کہ بات بات ... ... اور کیفیت ... ہوتی ہے اور وہ لطف طاقتِ تحریر و ... سے باہر ہے۔ ... سے جو رنج دل پر طاری ہوتا ہے ... سے خوب ... خوشیوں سے زیادہ لطف ... ... اختیاری نہیں یعنی موزونی ... ... میں رکھا ہے۔

رُباعی

سرمد غمِ عشق بوالہوس را ندہند   سوزِ دل پروانہ مگس را ندہند
عمرے باید کہ یار آید بہ کنار   ایں دولتِ سرمد ہمہ کس را ندہند

جنون بھی ایک طرح لازمۂ شاعری ہے۔ بعض محققوں کا قول ہے کہ دیوانہ اور عاشق اور شاعر کے خیالات بعض بعض مقامات پر متحد ہو جاتے ہیں۔ شاعر کو لازم ہے کہ سب طرف سے مطمئن اور خیالات سے منقطع ہو کر اُسی کام میں متوجہ اور غرق ہو جائے اور یہ بات سوائے مجنون کے یا عاشق کے کہ وہ برادر مجازی اس کا ہے۔ ہر ایک شخص سے نہیں ہو سکتی۔ مجنون کو اپنے جنون اور عاشق کو معشوق کے سوا دوسرے سے کچھ غرض نہیں۔ خدا یہ نعمت سب کو نصیب کرے۔

اکثر لوگ ایسے ہیں کہ جسمانی محنت سے مرکھپ کر انہوں نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا ہے۔ مگر لطفِ شعر سے بہرہ نہیں۔ اگر تمام عمر ضائع کریں۔ ایک مصرعۂ پُر درد اُن کی زبان سے نہ نکلے۔ اُن کا ذکر بھی انشاء اللہ اس سلسلے میں آئیگا۔

بعضے ایسے ہیں کہ ان سے کلام موزوں پڑھا بھی نہیں جاتا۔ بلکہ انہیں موزوں و ناموزوں میں فرق بھی نہیں معلوم ہوتا۔ یہ غضبِ الٰہی

ہے۔ خدا اس سے محفوظ رکھے۔ بعضے شاعر مضمون خوب نکالتے ہیں مگر زبان صاف نہیں کہ بیان بہ فصاحت کر سکیں۔ بعضے ایسے ہیں کہ زبان ان کی صاف ہے۔ مگر مضامین عالی نہیں۔ چنانچہ ہر ایک کی جگہ پر بجائے خود اشارہ کیا جائے گا۔ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ جوشِ مضامین اور شگفتگیِ طبع کے لئے بعض بعض موسم خاص ہیں۔ چنانچہ فصلِ بہار اور موسمِ برسات میں طبائع موزوں زیادہ تر شگفتہ ہوتے ہیں۔ بلکہ ناموزوں اور مردہ دلوں کی طبیعت میں بھی ایک حرکتِ مذبوحی پیدا ہوتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کے لئے اوقات اور مقامات خاص ہیں۔ اوّل خلوت کہ جہاں ذہن اور طبیعت نہ بٹے۔ خواہ گھر میں گوشۂ عافیت ہو۔ خواہ باغ صحرا۔ خواہ کنارِ دریا اور دل ہمہ تن اسی میں مصروف ہو۔

اکثر وقتِ شب جب خلقِ خدا اپنے کاموں سے تھک کر سو جاتی ہے۔ تب شاعر اپنے کام میں مصروف ہوتا ہے۔ جب تمام عالم سنسان ہو جاتا ہے۔ تب اس کی طبیعت میں شور پیدا ہوتا ہے۔ جوں جوں رات ڈھلتی جاتی ہے۔ خیال زیادہ تر بلند ہوتا ہے۔ اور مضمون پیرتا جاتا ہے۔ خصوصاً پچھلی رات اور قریب صبح کہ عالم چپ چاپ اور خاطر مطمئن۔ طبیعت صاف اور ہوا لطیف ہوتی ہے۔ دل شگفتہ ہوتا ہے۔ مضمون کی کاوش سے دل کو ایک لذّت حاصل

رتی ہے۔ مضامین عالی طبیعت سے اور الفاظ پر معانی زبان سے مترشح

ہوتے ہیں۔

شاعر کو چاہیے کہ طبیعت اس کی زیادہ تر قابل اور موثر ہو۔ مثل

آب رواں کہ جو رنگ اس پر پڑ جاتا ہے۔ وہی اس کا رنگ ہو جاتا

ہے۔ اور جس چیز پر پڑے ویسا ہی رنگ دیتا ہے۔ مائل کی رباعی

اس مقام پر مجھے یاد آئی ؎

کعبہ میں کبھی ہم نے اسے جاتے دیکھا
اور دیر میں ناقوس بجاتے دیکھا
شامل ہے بہ ہفتاد و دو ملت مائل
ہر رنگ میں پانی سا سماتے دیکھا

اس کی اپنی ہی طبیعت کا اثر ہوتا ہے۔ کہ جو مضمون فرحت یا

غم۔ رزم یا بزم کا باندھتا ہے۔ جتنی اس کی طبیعت اس سے متاثر

ہوتی ہے۔ اتنا ہی اثر سننے والوں کے دل پر ہوتا ہے۔ دنیا میں

بعضے لوگ ایسے ہیں کہ جب وہ شعر سنتے ہیں تو دل بے قرار اور

طبیعت بے اختیار ہو جاتی ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ ان کے

دل مثل آئینہ صاف اور طبیعت اثر پذیر ہے اور بعضے ایسے ہیں۔

کہ ان کے سامنے اگر طلسمات معنی کے دریا کو شیشہ میں بند کر کے رکھ دو

تو بھی انہیں خبر نہ ہو۔ سبب اس کا کدورتِ دل ہے کہ نورِ معنی اس میں اثر نہیں کر سکتا۔ روشن دلانِ اہلِ درد کے نزدیک طلوع و غروبِ آفتاب اور انقلاب، صبح و شام ہزاروں باغ تو بہارِ قدرتِ الٰہی کے شگفتہ کرتا ہے۔ اور تیرہ دلانِ بے خبر کے نزدیک کارگاہِ عالم ایک خراس یا دولاب ہے کہ دن رات چکّر میں چلا جاتا ہے۔

علمِ موسیقی کا لطف اور گلزارِ بوقلموں کی کیفیت ظاہر ہے۔ کہ بیان سے باہر ہے۔ لیکن جو بینائی سے محروم یا کانوں سے معذور ہیں، وہ بیچارے اُن کے لفظوں سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح جو لوگ لطفِ طبیعت اور صفائے دل سے محروم ہیں۔ وہ کیفیّتِ شعر و فصاحتِ کلام سے محروم ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ بعضی طبائع شعر سے متنفر پائی جاتی ہیں۔ اور دلیل اس کی یہ پیش کرتے ہیں کہ اس سے کچھ حاصل نہیں۔ اگر فائدے سے یہی مراد ہے کہ جس کے عمل سے چار پیسے ہاتھ میں آجائیں۔ تو بیشک شعر بالکل کارِ بے فائدہ ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ابنائے زمانہ نے آج کل شعر کو ایک ایسی ہی حالت میں ڈال دیا ہے۔ لیکن باوجود اس کے بھی جو لوگ طبعِ موزوں رکھتے ہیں۔ اگر زورِ طبیعت کو علوم اور تواریخ و قصص میں صرف کریں تو فائدہ و کسبِ دنیاوی بھی خاطر خواہ دیوے۔ اس سے

بڑھ کر یہ ہے کہ اکثر اشخاص علی العموم فن شعر گوئی کو گمراہی خیال کرتے ہیں۔ اور فی الحقیقت حال ایسا ہی ہے لیکن جو لوگ سرِ معنی اور اصل سخن کو پہنچے ہوتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر صنّاع خبث طبیعت سے صنعت کو بری طرح کام میں لائے تو اصل صنعت پر الزام نہیں آسکتا شیطان نے معلم الملکوت ہو کر گمراہی اختیار کی۔ پس اس کے لئے ہرگز علم کو ضلالت نہیں کہہ سکتے۔ مسائل فلسفہ و حکمت جن سے اہلِ ہدایت ثبوتِ باری اور تصدیق وحدتِ الٰہی کرتے ہیں۔ اسی سے اہل ضلالت دہر و الحادیہ استدلال کرتے ہیں۔ پس جس طرح سے اُن کی ضلالت سے فلسفہ و حکمت پر الزام نہیں آسکتا۔ اسی طرح شاعروں کی بدزبانی و بدخیالی سے شعر بھی تہمتِ کفر سے بدنام نہیں ہوسکتا۔ درحقیقت ایسے کلام کو شعر کہنا ہی نہیں چاہیئے۔ کیونکہ شعر سے وہ کلام مراد ہے۔ جو جوش و خروش خیالاتِ سنجیدہ سے پیدا ہوا ہے۔ اور اسے قوتِ قدسیہ الٰہی سے ایک سلسلہ خاص ہے۔ خیالاتِ پاک جوں جوں بلند ہوتے جاتے ہیں مرتبۂ شاعر کو پہنچتے جاتے ہیں۔ ابتدا میں شعر گوئی حکما اور علمائے متبحّر کے کمالات میں شمار ہوتی تھی۔ اور ان تصانیف میں اور حال کی تصانیف میں فرق بھی زمین و آسمان کا ہے۔ البتہ فصاحت و بلاغت اب زیادہ ہے۔ مگر خیالات خراب ہوگئے۔ سبب اس کا سلاطین و حکّامِ عصر کی قباحت ہے۔ انہوں

ہیں کام کاج کی باتوں اور بازاروں میں سودے سلف کے لین دین سے خاص و عام کی ضرورتیں پوری کرتی تھی۔ چونکہ بھاشا علمی اور تصنیفی زبان نہ تھی۔ اس واسطے اس میں استعارہ اور تشبیہ سے انشا پردازی کی باریکیاں اس اعلےٰ درجے پر نہ پہنچیں، جو سنسکرت میں ہیں۔ پھر بھی وہ ہر ایک موقع پر اس خوبی اور خوش اسلوبی سے اپنا مطلب پورا پورا ادا کرتی تھی۔ جس کی کیفیت کو جاننے والے ہی جانتے ہیں۔

جب بھاشا سے اُردو پیدا ہوئی تو کئی سو برس تک اس میں باتیں ہی باتیں رہیں۔ یعنی تحریر اور تصنیف تک نوبت نہ پہنچی۔ لیکن جس طرح کوئی زمین بے روئیدگی کے نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح کوئی زبان بے نظم کے نہیں رہ سکتی چنانچہ پریشان شعر تو کئی سو برس سے اُردو میں چلے آتے تھے۔ جب شاہجہان کے بعد زبانِ موجودہ کی عمر سو برس کی ہوئی۔ تو ولی شاعر پیدا ہوا۔ اور ساتھ ہی جا بجا دیوان ترتیب ہونے لگے۔

اُردو کے مالک اُن لوگوں کی اولاد تھے۔ جو فارسی زبان رکھتے تھے۔ اسی واسطے اُنہوں نے تمام فارسی بحریں اور فارسی کے دلچسپ اور رنگین خیالات اور اقسامِ انشا پردازی کا فوٹوگراف فارسی سے اُردو میں اتار لیا تعجب یہ ہے کہ اس نے اس قدر خوش ادائی اور خوشنمائی پیدا کی کہ ہندی بھاشا کے خیالات جو خاص اس ملک کے حالات کے بموجب تھے۔

انہیں بھی مٹا دیا۔ چنانچہ خاص و عام پپیہے اور کوئل کی آواز، چنپا، چنبیلی کی خوشبو بھول گئے۔ ہزار و بلبل اور نسرین و سنبل جو کبھی دیکھی بھی نہ تھیں۔ ان کی تعریفیں کرنے لگے۔ رستم و اسفندیار کی بہادری کوہ الوند اور بے ستون کی بلندی، جیحون سیحون کی روانی نے یہ طوفان اُٹھایا کہ ارجن کی بہادری، ہمالہ کی ہری بھری پہاڑیاں، برف بھری چوٹیاں، اور گنگا جمنا کی روانی کو روک دیا۔

اس میں شک نہیں کہ ایک اعتبار سے ہمیں فارسی زبان کا ممنونِ احسان ہونا چاہیے۔ کہ اس کی بدولت ہمارے کلام میں بلند پروازی اور جوش و خروش کا زور پیدا ہو گیا۔ اس کے استعاروں اور تشبیہوں سے بہت سے نازک اور لطیف خیالات کے ظاہر کرنے کی قوت ہو گئی۔ لیکن چونکہ یہ خیالات فارسی کی نظم و نثر سے آئے ہیں۔ جہاں کہ چمن میں باریک باریک استعاروں کی نسیم خوشبو پھیلاتی ہے۔ اور لطیف تشبیہوں کی شبنم شاداب کرتی ہے۔ اس لئے انہیں بھی یہ کا عطر اس زبان میں آیا۔ بیشک اُن کی بلند پروازی اور نازک خیالی جس درجے پر ہے اس کی حد نہیں۔ لیکن اصل مطلب کو ڈھونڈو۔ تو باریکی اور نازک بلیغ الفاظ اور استعاروں کے اندھیرے میں ایک جگنو ہے، کہ کبھی چمکا اور کبھی غائب۔

اے گلشنِ فصاحت کے باغبانو! فصاحت اسے نہیں کہتے کہ
مبالغے اور بلند پروازی کے بازوؤں سے اُڑے۔ قافیوں کے پروں
سے فرفر کرتے گئے۔ لفاظی اور شوکتِ الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھتے
گئے۔ اور استعاروں کی تہ میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ فصاحت کے معنی یہ
ہیں کہ خوشی یا غم، کسی شے پر رغبت یا اس سے نفرت، کسی شے سے
خوف یا خطر، یا کسی پر قہر یا غضب، غرض جو خیال ہمارے دل میں ہو۔
اس کے بیان سے وہی اثر، وہی جذبہ، وہی جوش سننے والوں کے
دلوں پر چھا جائے۔ جو اصل کے مشاہدہ سے ہوتا۔ بیشک مبالغے
کا زور۔ تشبیہ اور استعارے کی کمک زبان میں لطف اور ایک طرح کی
تاثیر زیادہ کرتا ہے۔ لیکن نمک اتنا ہی چاہیئے کہ جتنا نمک۔ نہ کہ تمام
کھانا نمک۔ تشبیہ اور استعارے ہمارے مطلب میں ایسے ہونے چاہئیں
جیسے کسی معرکہ یا دربار یا باغ کی تصویر پر آئینہ۔ کہ اس کی کیفیت کو زیادہ
روشن کرے۔ نہ اتنے آئینے کہ تصویر کا اصلی حال ہی نہ دکھائی دے۔ تب
اس موقع پر ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ ہمیں چاہیئے کہ اپنی ضرورت کے بموجب
استعارہ اور تشبیہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں۔ سادگی اور
بیان اصلیت کو بھاشا سے سیکھیں لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں۔
بلکہ اب رنگ زمانے کا کچھ اور ہے۔ ذرا آنکھیں کھول لینگے تو دیکھینگے۔

کہ فصاحت و بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے۔ جس یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے، ہار، طرّے ہاتھوں میں لیے حاضر ہیں اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے لیکن اب وہ بھی منتظر ہے کہ کوئی صاحب ہمت ہو۔ جو میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھائے۔

اے میرے اہل وطن! اس سے یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہاری نظم کو سامان آرائش سے مفلس کہتا ہوں۔ نہیں اس نے اپنے بزرگوں سے لمبے لمبے خلعت اور بھاری بھاری زیور میراث پائے۔ مگر کیا کرے کہ خلعت پرانے ہو گئے اور زیوروں کو وقت نے بے رواج کر دیا۔ تمہارے بزرگ اور تم ہمیشہ نئے مضامین اور نئے انداز کے موجد رہے۔ مگر نئے انداز کے خلعت اور زیور جو آج کے مناسب حال ہیں۔ وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں اور ہمیں خبر نہیں ۔ ہاں صندوقوں کی کنجی ہمارے ہم وطن انگریزی دانوں کے پاس ہے۔ اب مجھے دوسری طرف متوجہ ہونا واجب ہے۔ یعنی اے۔ انگریزی کے سرمایہ دارو! تم اپنے ملک کی نظم کو ایسی حالت میں دیکھتے ہو۔ اور تمہیں افسوس نہیں آتا۔ تمہارے بزرگوں کی یادگار عنقریب مٹا چاہتی ہے اور تمہیں درد نہیں آتا۔ اپنے خزانے اور نئے توشہ خانے سے ایسا بندوبست نہیں کرتے کہ جس سے وہ اپنی حیثیت درستی کر کے کسی دربار میں

جاننے کے قابل ہو۔ یہ اہلِ وطن کا قرض ہے کہ قرض سے زیادہ اس کا ادا کرنا واجب ہے۔

بھاشا پر جو فارسی نے اثر کیا اور اس سے نظم اور انشا نے اُردو نے ایک خاص لطافت حاصل کی۔ وہ ان لوگوں کی بدولت ہوئی کہ بھاشا اور فارسی دونوں سے واقف تھے۔ تم خیال کرو جو اسوقت بھاشا اور فارسی کا حال تھا۔ آج بعینہٖ اُردو انگریزی کا حال ہے۔ پس اس کی نظم میں اگر انگریزی کے خیالات کا پرتوہ حاصل ہوگا۔ تو انہی لوگوں کی بدولت ہوگا۔ جو دونوں زبانوں سے واقف ہونگے۔ اور سمجھیں گے کہ انگریزی کے کون سے لطائف اور خیالات ایسے ہیں جو اُردو کے لئے زیورِ زیبائش ہو سکتے ہیں۔

اے میرے اہلِ وطن! مجھے بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ عبارت کا زور مضمون کا جوش و خروش اور لطائف و صنائع کے سامان تمہارے بزرگ اس قدر دے گئے ہیں کہ تمہاری زبان کسی سے کم نہیں۔ کمی فقط اتنی ہے کہ وہ چند بے موقع احاطوں میں گھر کر محبوس ہو گئے ہیں۔ وہ کیا؟ مضامین عاشقانہ ہیں جن میں کچھ وصل کا لطف، بہت سے حسرت و ارمان، اس سے زیادہ ہجر کا رونا، شراب، ساقی، بہار، خزاں، فلک کی شکایت اور اقبالمندی کی خوشامد ہے۔ یہ مطالب بھی بالکل خیالی ہوتے ہیں۔ اور

بعض دفعہ ایسے پیچیدہ اور دُور دُور کے استعاروں میں ہوتے ہیں کہ عقل کام نہیں کرتی۔ وہ اسے خیال بندی اور نازک خیالی کہتے ہیں اور فخر کی موچھوں پر تاؤ دیتے ہیں۔ افسوس یہ ہے ان محدود دائروں سے ذرا بھی نکلنا چاہیں تو قدم نہیں اُٹھا سکتے۔ یعنی اگر کوئی واقعی سرگزشت یا علمی مطلب یا اخلاقی مضمون نظم کرنا چاہیں تو اس کے بیان میں بدمزہ ہو جاتے ہیں۔ پس ہمیں اس سے زیادہ کیا افسوس ہوگا۔ ہم اپنے زوروں کو بے اصل اور معدوم باتوں میں ضائع کرتے ہیں۔ اور جواہر کے خزانے کام کی جگہ نہیں لے سکتے۔ بے جگہ لٹاتے ہیں کیسی حسرت آتی ہے۔ جب میں زبانِ انگریزی میں دیکھتا ہوں کہ ہر قسم کے مطالب و مضامین کو نثر سے زیادہ خوبصورتی کے ساتھ نظم کرتے ہیں اور حق یہ ہے کہ کلام میں جان ڈالتے ہیں۔ اور مضمون کی جان پر احسان کرتے ہیں لیکن زہے نہیں کہا۔ سُن کر ترسیں۔ اپنے تئیں دیکھ کر شرمائیں۔ کاش! ہم جو کوئی بھی نثر لکھتے ہیں۔ اتنی ہی قدرت نظم پر بھی ہو جائے۔ اس کے اعلیٰ درجے کے نمونے انگریزی میں موجود ہیں۔ پھر بھی ہم دیکھتے ہیں ہمارے بزرگ ردیف و قافیہ کے ساتھ ایسی دلپسند بحریں اور نازک خیالیوں کے سامان ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں کہ اگر ہمت کریں تو کسی سے پیچھے نہ رہیں۔

اے میرے اہلِ وطن! ہمدردی کی آنکھیں آنسو بہاتی ہیں۔ جب

مجھے نظر آتا ہے کہ چند روز میں اس رائج الوقت نظم کا کہنے والا بھی کوئی نہ رہے گا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بہ سبب بے قدری کے اور کہنے والے پیدا نہ ہونگے۔ کئی پرانی مورتیں باقی ہیں، وہ چراغ سحری ہیں، انجام یہ کہ زبان ہماری ایک دن نظم سے بالکل محروم ہوجائیگی۔ اور اُردو میں نظم کا چراغ گل ہوجائیگا۔

میرے اہل وطن! آؤ آؤ۔ برائے خدا اپنے ملک کی زبان پر رحم کرو۔ اُٹھو اُٹھو۔ وطن اور اہل وطن کی قدیمی ناموری کو بربادی سے بچاؤ۔ تمہاری شاعری جو چند محدود احاطوں میں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے۔ اس کے آزاد کرنے میں کوشش کرو۔ نہیں تو ایک زمانہ تمہاری اولاد ایسا پائیگی کہ ان کی زبان شاعری کے نام سے بے نشان ہوگی اور اس فخر آبائی اور بزرگوں کی کمائی سے محروم ہونا بڑے افسوس کا مقام ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ بہر دست یہ کام کچھ مشکل ہے۔ کیونکہ ان محدود احاطوں میں جو کچھ موجود ہے۔ وہ ڈیڑھ سو برس سے آج تک بڑے بڑے سحر البیان فصیحوں نے شام کو صبح اور صبح کو شام کرکے پیدا کیا ہے۔ دلوں کے خون اور دماغوں کے روغن پسینے کرکے بہاتے ہیں۔ جب یہ دلپسند خیالات، شستہ الفاظ، پاکیزہ ترکیبیں، خوشنما تراشیں، مضمون کی سرگرمیاں، انداز کی شوخیاں پیدا ہوتی ہیں۔ کہ سننے والوں کے

دوانوں میں رس ڈالتی ہیں۔ اگر کوئی موزوں طبع چاہے۔ کہ تمام چیزیں، جو آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اُن میں سے جس کو چاہے لے لے اور ان پر شاعری خرچ کر کے وہی لطف کلام میں پیدا کر لے تو آج نہایت مشکل بات ہے۔ تمام عالم کی تعریفیں اور ہمارے شکریئے ان مزاروں پر پھول برساتے ہیں۔ جن کے سونے والوں نے انہیں چھوٹے چھوٹے احاطوں میں وہ کچھ کیا کہ سالہا سال چاہئیں جو ویسے لوگ پیدا ہوں۔ ویسی کوششیں کریں اور ویسے ہی لطیف اور خوش آیند انداز عموماً زبان میں پیدا ہوں۔

تو بھی ہمیں مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ اگر کوشش کریں گے تو ہم بھی کچھ نہ کچھ کر رکھیں گے۔ کیونکہ دِلّی دن بھر میں گلزار نہیں ہو گئی تھی۔ اِس سے بڑھ کر یہ ہے کہ وہ مضامین جو اب تک اُن احاطوں کو آباد کر رہے ہیں وہ خود اس قیامت کے مضمون ہیں۔ جن میں شیطانِ ملعون نے اپنے سارے مزے کوٹ کوٹ کر بھر دیئے ہیں۔ اگر کسی شاعر کی زبان میں قدرتی لذّت کم ہو تو بھی مضامینِ مذکورہ اپنی گرمی میں رنجک کی طرح شعر کو لے اُڑتے ہیں۔ البتہ عام مضامین میں ایسی چمک دمک پیدا کرنے کے لئے ایک قدرتی قوّتِ زبان و بیان اور اصلی فصاحت اعلےٰ درجے کی چاہیئے۔ تب ہر ایک مضمون کو ویسا ہی گرما دے جس سے سُننے والوں کا دل پھڑک کر لوٹ جائے۔ اگرچہ مدّت سے مجھے اور اکثر اہلِ وطن کو اس کا خیال ہے۔

مگر اب تقریر میں آنے کا باعث یہ ہے کہ دیکھتا ہوں کہ آج کل ہماری گورنمنٹ اور ان کے ارکین کو اس طرف توجّہ ہوئی ہے۔ جن کے دل ہماری تعلیم کا ذمہ اُٹھائے ہوئے ہیں۔ حق پوچھو تو ہماری انشا کے ستارۂ اقبال کی مبارک ساعت ہے۔ اس موقعہ پہ ہماری تھوڑی کوشش بہت سا اثر کرے گی۔

میرے اہلِ وطن! تمہاری جماعت دو فرقوں سے مرکب ہے ایک ہندو ایک مسلمان۔ تم جانتے ہو ہندو کون ہیں؟ ہندو وہ ہیں کہ آج ہم جس بات کی آرزو کرتے ہیں۔ وہ اُن کی زبان کا اصلی جوہر ہے۔ اگر بھاشا ہے تو وہ اصلی حالتوں کے ادا کرنے میں سب پر فائق ہے۔ سنسکرت کی قوّتِ نظم خود حدِّ بیان سے باہر ہے۔ کیونکہ مضامین شاعرانہ درکنار۔ اس نے تاریخ سے لے کر جغرافیہ، طب منطق فقہ تک جس علم کو لیا نظم کی جنتری میں کھینچ لیا۔ دوسرا جزو مسلمان۔ جن کی اصل عرب، عربی وہ زبان ہے جس میں مرد تو بالائے طاق۔ گھروں کی عورتیں بلکہ لونڈیاں جب اپنی جوش تقریر پر آتی تھیں۔ تو اُن کا کلام ایک پُرزور نظم ہو جاتا تھا۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں کہ ایسے بزرگوں کی اولاد اپنے بزرگوں کی میراثوں سے محروم ہو۔ کیا یہ حیف کی جگہ نہیں کہ آج ہماری زبان حرفِ تاثیر سے خالی ہو، کیا یہ رنج کی جگہ نہیں کہ اوروں کے سامنے

ہماری زبان ضعفِ بیانی کے ساتھ ہزار نقصوں سے مطعون ہو۔
اے خاکِ ہندوستان! اگر تجھ میں امرء القیس اور لبید نہیں تو کوئی کالیداس ہی نکال۔

اے ہندوستان کے صحراؤ! فردوسی اور سعدی نہیں تو والمیک ہی پیدا کر دو۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ شاعری کے لئے اوّل قدرتی جوہر بعد اس کے چند تحصیلی اور علمی لیاقتیں چاہئیں۔ بعد اس کے شوق کامل اور مشق دوامی، میں نثر کے میدان میں کبھی سوار نہیں، پیادہ ہوں اور نظم میں خاک افتادہ۔ مگر سادہ لوحی دیکھو کہ ہر میدان میں دوڑنے کو آمادہ ہوں۔ یہ فقط اس خیال سے ہے کہ میرے وطن کے لئے شاید کوئی کام کی بات نکل آئے۔ میں نے آج کل چند نظمیں مثنوی کے طور پر مختلف مضامین میں لکھی ہیں۔ جنہیں نظم کہتے ہوئے شرمندہ ہوتا ہوں۔ اور ایک مثنوی جو رات کی حالت پر لکھی ہے۔ اس وقت گذارش کرتا ہوں،

مثنوی موسوم بہ شب قدر

اے آفتاب صبح سے نکلا ہوا ہے تو
عالم کے کاروبار میں دن بھر پھرا ہے تو

ہیں روز و شب زمانے کے پیہم قدم ترے
پیمانے محنتوں کے یہ ہیں بیش و کم ترے

کلفت سے دن کی ہو گیا منہ تیرا زرد ہے
اور ڈالی اُسپہ شام نے غربت کی گرد ہے

ہونا زبانہ بسکہ ہے وابستہ شام سے
اور تو بھی ہے تھکا ہوا دنیا کے کام سے

دامانِ کوہسار میں اب جا کے سو رہو
دن بھر کا کام شام کو سمجھا کے سو رہو

اے دوست تیرا حکم تھا جاری جہان میں
اور روشنی تھی عام زمیں آسمان میں

جو کچھ کہ تھے سفید و سیہ آشکار تھے
جاری سب اپنی اپنی جگہ کاروبار تھے

دولابِ چرخ پر مگر اپنا مدار ہے
چلتا اسی پہ دورِ خزاں و بہار ہے

دن ہے خدا نے ہم کو دیا کام کے لئے
اور رات کو بنایا ہے آرام کے لئے

رخصت ہو تو کہ آتی شب مشک ریز ہے
پھر صبح اُٹھ کے چلنا گر بزا گریز ہے

آ اے شبِ سیاہ کہ لیلائے شب ہے تو
عالم میں شاہزادیٔ مشکیں نسب ہے تو

آمد کی تیری شان تو زیب رقم کروں
پر اتنی روشنائی کہاں سے بہم کروں

ہونا وہ بعد شام شفق میں عیاں ترا ‫ ‫ اڑنا وہ آبنوس کا تخت رواں ترا
تھا دن مگر رہا وہی عالم نگاہ میں ‫ ‫ لہرانا پرنیان و حریر سیاہ میں
چمکے گا لشکر اب جو ترا آسمان پر ‫ ‫ فرماں نشان میں یہ اڑیگا جہان پر
تا صبح ہو وسے کارگہ روزگار بند
آرام حکم عام ہو اور کار و بار بند
اے رات سنتا ہوں کہ ترے سر پہ تاج ہے ‫ ‫ ہر گوہر اس میں ملک حبش کا خراج ہے
لکھتا ہوں سب حساب پڑھا جاتا کچھ نہیں ‫ ‫ ایسا سیاہ ہے کہ نظر آتا کچھ نہیں
اس رنگ پہ دکھا رہی کیا آب و تاب ہے
تیرا چمکتا چہرہ سیاہ آفتاب ہے
عالم پہ تو جو آتی ہے رنگ اپنا پھیرتی ‫ ‫ ہاتھوں سے مشک اڑاتی ہے عنبر بکھیرتی
دنیا پہ سلطنت کا تری دیکھ کر حشم ‫ ‫ کھاتا ہے دن بھی تاروں بھری رات کی قسم
روئے زمیں پہ جل رہے تیرے چراغ ہیں ‫ ‫ اور آسماں پہ کھلتے ستاروں کے باغ ہیں
بجلی ہنسے تو رخ ترا دیتا بہار ہے ‫ ‫ شبنم کو موتیوں کا دیا تو نے ہار ہے
سب تجھ کو لیتے آنکھوں پہ ہیں بلکہ جان پر
پورا ہے تیرا حکم پر آدھے جہان پر
چھائی غرض خدا کی خدائی میں رات ہے ‫ ‫ اس وقت یا تو رات ہے یا حق کی ذات ہے
خلقت خدا کی سوتی ہے غافل پڑی ہوئی ‫ ‫ اور رات سائیں سائیں ہے کرتی کھڑی ہوئی

سوتا گدا ہے خاک پہ اور شاہ تخت پر ماہی بزیر آب ہے طائر درخت پر
ہے بستر پڑا کوئی بچھونوں پہ گھر میں ہے داماں دشت پر کوئی سوتا سفر میں ہے
گھوڑے پہ اپنے اونگھ گیا ہے سوار بھی چوکا ہے بلکہ راہزن نابکار بھی
القصہ ہے امیر کوئی یا فقیر ہے عورت ہے یا کہ مرد جوان ہے کہ پیر ہے
بچہ کہ ماں کی گود میں ہے بلکہ پیٹ میں سب آ گئے ہیں نیند کی اس دم لپیٹ میں

جس کو پکارو وہ سوئے ملک عدم گیا
دریا بھی اب تو چلنے سے شاید ہو تھم گیا

وہ آفتاب تھا جو چمکتا جہان پر بیٹھا تھا جس کا سکہ زمین آسمان پر
کھینچے ہوئے شفق کا نشان زرق برق سے رکھ کر کرن کا تاج نکلتا تھا شرق سے
اس کے عمل کو توڑنا تیرا ہی کام ہے سکہ ہے اب ستاروں کا اور تیرا نام ہے

محنت ثمر تھا اس کا تو راحت ہے پھل ترا
چاندی تھا اس کا حکم تو سونا عمل ترا

مزدور جا بجا تھے تو دکھ درد پا رہے اور پاؤں تا سروں کے پسینے بہا رہے
بار گراں غریبوں نے سر پر اٹھائے ہیں جب چار پیسے شام کو لے گھر میں آئے ہیں

اے شب تمام دن کی مصیبت سے ہار کے
تیرے عمل میں پاؤں ہیں سوتے پسار کے

دن بھر کے ہیں مسافر محنت زدہ بہت آوارہ تا بہ شام ہیں شامت زدہ بہت

آتے ہیں دن کی دھوپ میں منزل جو مار کر
رستہ میں بوجھ بھی نہیں رکھا اُتار کر

اے رات تو نے ڈالا جو رحمت کا سایہ ہے
اس وقت ان بچاروں نے آرام پایا ہے

اس دم امیرزادے کئی بے نظیر ہیں
مسند کے آسمان پہ بدرِ منیر ہیں

دن کا تو رنگ ہو چکا اب رنگ اور ہے
پردے میں شب کے بادہ گلگوں کا دور ہے

اک گلعذار سامنے سرگرمِ ناز ہے
اور جام دے رہی نگہِ نیم باز ہے

کھٹکے لگا کے کمرے میں اب بند ہوتے ہیں
اور وصل کے بچھونے میں پیوند ہوتے ہیں

اکثر امیر لیٹے ہیں نعمت کے ناز میں
پر دل کو ان کے دیکھو تو ہے سوز و ساز میں

سامانِ عیش سب ہیں مہیا کیے ہوئے
جو مانگیے زمانہ ہے حاضر لیے ہوئے

مخمل کا فرش ہے مگر آرام ہی نہیں
جھپکے پلک سو اس کا کہیں نام ہی نہیں

ان کے سوا بھی خلق میں انساں بہت سے ہیں
آرام نے دیے ہاتھ ہاتھ رہاں بہت سے ہیں

دن ہووے یا ہو رات انہیں کام کچھ نہیں
اور کام ہے تو یہ ہے کہ آرام کچھ نہیں

وہ بھی پڑے ترستے ہیں لطفِ حیات کو
کانٹوں پہ لوٹ لوٹ کے کاٹیں گے رات کو

اور ان کے زیرِ سایہ پڑا اک غریب ہے
دن بھر اُٹھاتا بوجھ وہ آفت نصیب ہے

[illegible]   [illegible] آیات شاعر کی
[illegible]   [illegible] پڑا ہے [illegible]

[illegible] قیامت آئے [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible]   [illegible]
[illegible]   [illegible] ہیں
[illegible] خیال [illegible]   [illegible] چراغ وال
[illegible]   [illegible] کبھی کبھی
[illegible]   دیکھا [illegible] بچے نے
[illegible]   [illegible] کے

بیٹھا [illegible] خواب کو
[illegible] گیا اٹھا کر کتاب کو

تب مدرسے کے سب طلبا اپنے حال پہ   کل صبح امتحان ہے سو اس کے خیال میں
[illegible]   پڑھتے تھے جا بجا [illegible] فکر و غور سے
[illegible] شب [illegible]   کل صبح اپنی جان ہے اور امتحان ہے

[illegible] دیر [illegible]
قسمت [illegible] سب پہ محنت ضرور ہے

اور وہ جو لکھ رہی ہے مہاجن جہان میں
آدھی بچی ہے پردہ اکڑی ہے کان میں
گنتی ہیں دام دام کی ہے قسم دیجئے
بیٹھا ہے گودیں بہی کھاتا لئے ہوئے
ہے سارے لین دین کی میزان تمام کی
لیکن غضب ہے بدھ نہیں ملتی چھدام کی

اور دیکھنا نجومی دانا کی شان کو
ہے کس نظر سے دیکھ رہا آسمان کو
اک آنکھ دوربین پہ ہے اک کتاب پر
ہے محو اپنے زائچہ میں اک حساب پر
گنتا ہے اسکی تارے ہی گن کر تمام رات
پر اب تو فکر ہے یہی دن بھر تمام رات
پیدا ہوئے نئے نئے روشن ضمیر ہیں
نکلے نئے ستارے سر چرخ پیر ہیں
اک جنتری بناؤں کہ طرز جدید ہو
چمکے جو اس میں اپنا ستارہ تو عید ہو

اے رات تیرے پردۂ دامن کی اوٹ میں
دزدِ سیاہ کار بھی ہے اپنی چوٹ میں
بیٹھا نقب لگا کے کسی کے مکان میں ہے
اور ہاتھ ڈالا اس کے اساثاثہ میں ہے
اسباب سب اندھیرے میں گھر کا ٹٹول کر
ہے چپکے چپکے دیکھ رہا کھول کھول کر
لے جائے گا غرض کہ جو کچھ ہاتھ آئے گا
دیکھو کیا کیا کس نے ہے اور کون اڑائے گا

اس تیرہ شب میں شاعر روشن دماغ ہے
بیٹھا اندھیرے گھر میں جلائے چراغ ہے
ڈوبا ہے اپنے سر کو گریباں میں ڈال کے
اڑتا پھرے ہے کھولے ہوئے پر خیال کے

لاتا فلک سے ہے کبھی تارے اُتار کر
جاتا زمیں کی تہ میں ہے پھر غوطہ مار کر
پڑھتا ہے ذرّہ ذرّہ پہ افسوں نئے نئے
ہو جاتے ہیں وہی دُرِ مضموں نئے نئے

مضمونِ تازہ گر کوئی اس آن مل گیا
یوں خوش ہے جیسے نقشِ سلیمان مل گیا

اس تیرہ شب کے پردے میں شاعر جو چور ہے
پھرتا ٹٹولتا ہوا مانندِ کور ہے
مطلب اُڑاتا شعر سے مضمون غزل سے ہے
لاتا پر ایسے ڈھب سے لفافہ بدل کے ہے

تعریفیں اس کی کرتے ہیں جو شعر سنتے ہیں
مضموں گیا ہے جن کا وہ سر بیٹھے دھنتے ہیں

عالم ہے اپنے بسترِ راحت پہ خواب میں
آزاد سر جھکائے خدا کی جناب میں
پھیلائے ہاتھ صورتِ امیدوار ہے
اور کرتا صدقِ دل سے دُعا بار بار ہے
مجھ کو تو ملک سے ہے نہ ہے مال سے غرض
رکھتا نہیں زمانے کے جنجال سے غرض

یارب یہ التجا ہے کرم تو اگر کرے
وہ بات دے زباں پہ کہ دل میں اثر کرے

آجاتی پر کبھی جو ہے شوخی مزاج میں
کرتا ہے اس کو خرچ عدو کے علاج میں
کرجاتا صاف دشمنِ بد میں پہ چوٹ ہے
اچھا تو ہے کہ رکھتا نہیں دل میں کھوٹ ہے

کھوٹا اگر زباں کا ہے دل کا کھرا تو ہے
اتنا ضرور ہے کہ ذرا مسخرا تو ہے

رات یہ جو تو نے سرِ شام آن کر　　سجادۂ سیاہ بچھایا ہے تان کر
اس پہ حق پرست جو یادِ خدا میں ہے　　بیٹھا رہِ فنا پہ ہوا سے بقا میں ہے
کو اُسی کی ذات سے ہے لو لگی ہوئی　　اور دل میں دمبدم ہے لگن سی لگی ہوئی
کب تک رہے حباب گلا گھونٹ گھونٹ کر
اپنی ہوا میں ایک ہو پھر ٹوٹ پھوٹ کر

یا میں چل رہا کہیں اس دم جہاز ہے　　اہلِ جہاز جن کا خدا کارساز ہے
بیٹھے اسی کی آس پہ ہیں دل دیے ہوئے　　کچھ حسرتیں ہیں دل میں کچھ ارماں لیے ہوئے
مراد دیتی ہوائے مراد ہے　　پر دل کو بھولتی نہیں طوفاں کی یاد ہے
آنکھیں سبھوں کی لگ رہی ہیں بادبان پر　　اور جاتی ہے دُعا کی صدا آسمان پر
یہ سب کے سب ہیں بیٹھے ہوا کی امید پر
اے ناخدا تو رہیو خدا کی امید پر

دل دے رہا جو شیرِ محبت کے جام ہے　　ماں دیکھو اپنی نیند کو کرتی حرام ہے
ہر چند کام کاج سے ہے گھر کے تھک رہی　　بچّہ کو ہاتھ سے ہے برابر تھپک رہی
اور کہتی ہے کہ مجھ کو پڑے یا نہ کل پڑے　　ایسا نہ ہو کہ یہ کہیں ڈر کر اچھل پڑے
ماں کو تو سوتے جاگتے اس کا ہی دھیان ہے
کروٹ نہیں بدلتی کہ ننّھی سی جان ہے

پر جاتے تیغ سا حال اسی جاں بلب کا ہے　　سب جن کو کہہ رہے ہیں کہ مہمان شب کا ہے

مثنوی موسوم بہ صبحِ اُمید

جب کیا صبح نے روشن فلک مینائی — بسترِ خواب سے میں لے کے اُٹھا انگڑائی
آنکھ مل کر جو نظر کی سوئے میدانِ جہاں — ذرّہ ذرّہ میں نظر آیا رخِ جانِ جہاں
کام کرتی تھی جہاں تک نگہِ دور انداز — تھا کھلا آنکھوں کے آگے چمنِ قدرتِ راز
سبز و شاداب تمام ایک طرف دامنِ کوہ — جس پہ ہے فرشِ زمیں گلشنِ گردوں شکوہ
برگ برگ اس کا ہے آئینہ لیے پیشِ نظر — جن میں ہیں جلوہ نما دل کی مرادوں کے ثمر
آرزوؤں سے کھلے ہیں گلِ رعنا یکسر — جن سے نکلینگے ثمرہائے تمنّا یکسر
قلّۂ کوہ کہ تھا چرخِ بریں سے ہمراز — رکھتا تھا طولِ امل سے بھی سوا راہِ دراز
تھی تو ظاہر میں بہت سخت چڑھائی اسکی — اور مسافت بھی کسی نے نہیں پائی اسکی
اس کے چڑھنے سے مگر تنگ نہ جی ہوتے تھے — دم اُکھڑتے تھے اور سینے قوی ہوتے تھے
گرچہ تھا پاؤں اُٹھانے کا نہ یارا دل کو — کوئی دیتا تھا مگر ایسا سہارا دل کو
کہ چڑھائی جو نظر آ رہی تھی دور بہت — دل یہ کہتا تھا کہ ہمت میں ہے مقدور بہت
جشنِ شاہانہ کا ساماں نظر آتا تھا وہاں — سازِ عشرت کوئی در پردہ بجاتا تھا وہاں
دل اس آواز پہ اس طرح کھچے جاتے تھے — گویا ذرّے سوئے خورشید اڑے جاتے تھے
اس طرف میرا دلِ زار بھی یوں آہ چلا — جیسے بلبل سوئے گل کبک سوئے ماہ چلا

کاہ کی طرح بسے گاہ رُبا پہنچا ہیں
الغرض منزلِ مقصود پہ جا پہنچا ہیں

دیکھا اک باغ کہ قدرت نے لگایا ہے وہاں
گل خود رو نے عجب جلوہ دکھایا ہے وہاں

مخملِ سبز سے ہے سبزۂ تر پا انداز
رنگِ گل اس پہ دکھاتے ہیں تماشا انداز

برسرِ کوہ جو پانی کا ہے چشمہ جاری
نہر بن بن کے دکھاتا ہے عجب سرشاری

آب یوں سر بہ ہے بدامانِ جبل مار رہا
سانپ سیماب کا ہو جیسے کہ بل مار رہا

سنگ مرمر کی لب آب اک سل ہے پڑی
اس پہ اک رشک پری ہاتھ میں پھولوں کی چھڑی

رنگ رخ کو گل گلزار سے چمکائے ہوئے
بیٹھی اک پاؤں کو ہے پانی میں لٹکائے ہوئے

اس پہ ہے چتر کی جا سایہ فگن سبز نہال
پھول برساتی ہے پہلو میں کھڑی بادِ شمال

نوجوانانِ چمن بزم سجاتے ہیں کھڑے
فرش گلہائے بہاری کا بچھاتے ہیں کھڑے

سر پہ جو اس کے دھری ہے کلہ تاجوری
ہے بجائے دُرِ الماس وہ پھولوں سے بھری

اس کے سر پھول ہیں لیکن یہ تماشہ ہے الگ
کہ ہر اک آنکھ کو رنگ اپنا دکھاتا ہے الگ

اس سے ہر شخص شمیم اپنی جدا لیتا ہے
ہر دماغ اس سے نئے ڈھب کا مزا لیتا ہے

رُخ جو ہے آئینہ روئے تمنا اس کا
شمع ساں چاروں طرف ایک ہے جلوہ اس کا

اک طرف عقل ہے اک سمت ہے تدبیر کھڑی
آگے جام مئے غفلت لئے تاثیر کھڑی

دیتی ہر دل پہ ہے وہ نور سے تنویر جدا
کامیابی کی دکھا دیتی ہے تصویر جدا

رکھتی ہے ایسا اثر نرگسِ جادو اس کی
پڑ رہی دل پہ نظر ہے جو ہر اک سو اس کی

ہے ہر اک شخص سمجھتا کہ اشارا ہے مجھے
تڑپ اٹھتا ہے ہر اک دل کہ پکارا ہے مجھے

اسکے دربار میں ہیں شاہ و گدا آئے ہوئے — اپنے دامانِ تمنا کو ہیں پھیلائے ہوئے
دمبدم ہے جو نسیم سحر آتی جاتی — بوئے امید ہے اک اک کو سنگھاتی جاتی
دل نے دربار جیں وقت دکھایا مجھ کو — اور طلسمات کا عالم نظر آیا مجھ کو
دیر تک دل رہا تصویر تہِ آئینہ — پر جو تہ بات کی تھی فہم میں وہ آئی نہ
غور کی رازِ نہفتہ میں بہت سی میں نے — شجر چیز یہ لیکن جو نظر کی میں نے
دیکھتا کیا ہوں کہ بیٹھا ہے ہمائے اقبال — دونوں پر کھولے ہوئے ہے بہوائے اقبال
دیکھتے ہی مجھے یوں بولا بصد خوش حالی — آؤ آزاد تمہاری ہی جگہ تھی خالی
آؤ تم قید تعلق سے ہو آزاد بہت — اپنی وارستگی دل میں ہو تم شاد بہت
آؤ یاں سایۂ اقبال میں لیویں تم کو — لاؤ کیا آرزو ہے دل سے کہ دیویں تم کو
آؤ اس سائے میں تم ابر گہر بار ہے یہ — یعنی شہزادیِ امید کا دربار ہے یہ
اس کے نغمے سے جو یہ راز پُرافسوں نکلا — دل سے بے ساختہ یہ مطلع موزوں نکلا
آنکہ آباد ترے دم سے ہے دائم دنیا — اور مثل ہے کہ بہ امید ہے قائم دنیا
آنکہ ہے تیری ہوا میں دلِ شیدا گلشن — لہلہاتے ہیں تیری یاد میں کیا کیا گلشن
دل ہر گلشن پہ ہے چھایا ہوا نیرنگ ترا — کونسا پھول ہے جس پر کہ نہیں رنگ ترا
کونسا دل ہے کہ جس پر نہ چلے دم تیرا — کون انساں ہے خوشی سمجھے نہ جو غم تیرا
کونسا باغ ہے کہ جس میں صبا تیری نہیں — کونسا گل ہے لگی جس کو ہوا تیری نہیں
کونسا دل ہے کہ جس دل میں نہیں چاہ تری — کونسا کوچہ ہے جس میں کہ نہیں راہ تری

تار برقی سے سوا حکم ترا چلتا ہے
دیکھا جس ملک میں واں سکہ ترا چلتا ہے

عہد آئندہ کا میداں ہے اندھیرا بالکل
غیب نے رنگ سیہ جس پہ ہے پھیرا بالکل
اس میں چلتے تیری تدبیر کے ہیں تیر سدا
اسی میداں میں ہیں پھرتے ترے نخچیر سدا

ذرہ ذرہ سے ترے اگتے ہیں اشجار مراد
خاک میں تیری نظر آتے ہیں گلزار مراد

جب کہ کھیتوں میں خزاں آگ لگاتی پھرتی
اور ہوا باغ میں ہے خاک اڑاتی پھرتی

چشمے خشک اور چمن ہوتے ہیں بے آب پڑے
چاہ بے آب تو ٹوٹے ہوئے ڈول سب پڑے

پیر دہقاں ہے کہیں بے سر و ساماں بیٹھا
باغباں خاک پہ حیران و پریشاں بیٹھا

ہوتا اس وقت مصیبت میں نہیں یار کوئی
نہ مددگار کوئی اور نہ غمخوار کوئی

ہاں مگر تو کہ جب اس وقت میں آجاتی ہے
جلوہ گر باغ مراد اس کو دکھا جاتی ہے

ابر تر سامنے آنکھوں کے لے آتی ہے کبھی
پھلے پھولے اسے اشجار دکھاتی ہے کبھی

کبھی کھیتوں کو ہرا کر کے دکھا دیتی ہے
کر کے خرمن کبھی انبار لگا دیتی ہے

دمبدم تازہ تسلی آ کے سناتی ہے اسے
باغ سبز ایسا غرض اپنا دکھاتی ہے اسے

تھا جو مایوس پڑا سینہ و سر باندھ کے وہ
اٹھ کھڑا ہوتا ہے اک بار کمر باندھ کے وہ

دھوپ میں کھاتا ہے بہاتا ہے پسینہ اپنا
کرتا لبریز مرادوں سے ہے سینہ اپنا

ہر مصیبت میں غرض تو ہے سہارا اس کا
تیری ہی آس پہ ہوتا ہے گذارا اس کا

اہلِ ہمت جو ہیں مردانِ تجارت پیشہ
مشغلہ جن کا سیاحت ہے سفر اندیشہ

کوہ و صحرا میں ہیں وہ زادِ سفر باندھے ہوئے
اور چلے جاتے ہیں دن رات کمر باندھے ہوئے

نہ تو پانی کا ہے آرام نہ کھانے کا مزا
اٹھ گیا انکے نصیبوں سے زمانے کا مزا

ہر قدم پر سرِ راہ خطر ہیں لاکھوں
ایک جوکھوں ہے اگر پاس تو ڈر ہیں لاکھوں

خلشِ خار سے ہے دامنِ دل چاک کبھی
صدمۂ یادِ وطن کرتا ہے غمناک کبھی

دل تو ہے سنگِ مصیبت سے شکستہ انکا
اور کسی طرح سے کٹتا نہیں رستہ اُن کا

ہر قدم تو ہے مگر اُن کی کمر باندھ رہی
سمتِ مقصود پہ ہے تارِ نظر باندھ رہی

حسنِ انجام منافع کا دکھاتی ہے کہیں
کرسیاں جاہ و مراتب کی دکھاتی ہے کہیں

سامنے جلوۂ اقبال دکھاتی ہے انہیں
اور خزانے کہیں پُر مال دکھاتی ہے انہیں

کامیابی سے کہیں پھر کے وطن میں لاتی
آبِ رفتہ کو ہے پھر جوئے چمن میں لاتی

طائرِ دل پر پرواز ہیں پھیلائے ہوئے
اور ترا شوق لئے جاتا ہے دوڑائے ہوئے

گرم ہوتا سرِ میداں ہے جو بازارِ ستیز
تیغ خونبار کہیں اور کہیں خنجر خوں ریز

ہوتی حملوں سے دلیروں کے ہے آفت برپا
عرصۂ جنگ میں ہوتی ہے قیامت برپا

نعرۂ توپ سے شیروں کے ہیں منہ مڑ جاتے
بلکہ ہیں گنبدِ نیلی کے دھوئیں اُڑ جاتے

کہیں خنجر کہیں شمشیر نظر آتی ہے
سامنے موت کی تصویر نظر آتی ہے

پر وہیں معرکۂ جنگ میں ہے تو آتی
ہاتھ میں ہے لئے اک شیشۂ جادو آتی

ایسا مستِ مئے جرأت انہیں کر دیتی ہے ۔۔۔ بلکہ پیمانۂ دل خون سے بھر دیتی ہے
کہ نشا آنکھوں پہ عینک ہے لگا تا گویا ۔۔۔ سیرِ فانوسِ خیالی ہے دکھاتا گویا
دیتی ہے چشمِ تصوّر میں ہر اک کام دکھا ۔۔۔ ہے پھر اُس کام کا دیتی انہیں انجام دکھا
کہ رُخِ فتح کبھی دیکھتے ہیں گلناری ۔۔۔ زیبِ سر دیکھتے ہیں تاجِ سپہ سالاری
فتحیابی سے کبھی پھیر کے ہے گھر لاتی ۔۔۔ پیشِ لشکر ہے بسر دواری لشکر لاتی
شہرتِ عام کے دربار میں لاتی ہے انہیں ۔۔۔ فخر و اعزاز کی کرسی پہ بٹھاتی ہے انہیں
نام پر فتح کے نقّارے بجا دیتی ہے ۔۔۔ شرق سے غرب تک اک دھوم مچا دیتی ہے
پرچمِ فتح کبھی لا کے ہے لہرا دیتی ۔۔۔ فتحیابوں کے ہے سر پہ اُسے جلوہ دیتی
نام اُن کے نشانوں پہ رقم دیکھتے ہیں ۔۔۔ ان کو اس طرح سے شہرت میں علم دیکھتے ہیں
سیکڑوں دورِ فلک سر پہ گذر جائیں گے ۔۔۔ وہ ستارے سے چمکتے ہی نظر آئیں گے

دیکھتی چشمِ تصوّر ہے یہ جب باغِ مراد ۔۔۔ اور چمک اُٹھتے ہیں سینوں میں جو ہیں داغِ مراد
سر بکف بر سرِ میداں ہیں دلاور آتے ۔۔۔ اہلِ جوہر ہیں دکھاتے ہوئے جوہر آتے
جامِ دل خونِ شجاعت سے چھلک جاتے ہیں ۔۔۔ نعرۂ اہلِ وفا تا بفلک جاتے ہیں
آتے جانباز جو ہیں سر پہ کفن باندھے ہوئے ۔۔۔ اور ہوائیں بسرِ چرخِ کہن باندھے ہوئے
آبِ شمشیر کو شربت کی طرح پیتے ہیں ۔۔۔ اور جو مرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم جیتے ہیں
خونِ دلیروں کے ہیں پانی کی طرح بہ جاتے ۔۔۔ اور جگر سینوں میں خوں ہو کے ہیں رہ جاتے

گرم ہو جاتا ہے یہ موت کا بازار وہاں — کہ خریدار پہ گرتا ہے خریدار وہاں
جان و تن موت کے مُنہ کا ہیں نوالہ ہوتے — آسماں اور زمیں ہیں تہ و بالا ہوتے
فتحیابی سے بہت چہرے ہیں گلگوں ہوتے — اور بہت تن بسرِ خاک ہیں پُرخوں ہوتے
اے امید ایسے ہزاروں ہیں کرشمے تیرے — یوں ہی بہتے ہیں سدا خون کے چشمے تیرے



ہیں کتب خانۂ ہستی میں بہت صاحبِ علم — اور بہت مدرسۂ دہر میں ہیں طالبِ علم
سوزِ محنت سے بہاتے ہیں پسینے اپنے — حسرتوں سے کئے لبریز ہیں سینے اپنے
نہ تو کھانے کا ہے کچھ فکر نہ پانی کا خیال — ذوقِ راحت ہے نہ ہے لطفِ جوانی کا خیال
ہو گئے وصل کتابوں میں ہیں وصلی کی طرح — بلکہ پیوندِ ورق ہیں جزوِ اصلی کی طرح
پھرتے دن بھر ہیں کتابیں لئے سودائی سے — ہاتھ اُٹھا بیٹھے اسی شغل میں بینائی سے
تن کو راحت نہیں اور جان کو آرام نہیں — دن ہو یا رات انہیں محنت کے سوا کام نہیں
روز و شب خونِ جگر اپنا جو کھاتے ہیں وہ — اور بلا بارِ مشقت کی اُٹھاتے ہیں وہ
ان مصائب کی ہے تو ہی انہیں طاقت دیتی — لطفِ انجام سے ہے حسنِ لیاقت دیتی
دیدۂ دل میں لگا دیتی ہے سرمے کیا کیا — دیتی ہے شاہدِ مقصود کو جلوے کیا کیا
اہلِ تصنیف کو ہے عمرِ دوامی دیتی — بادۂ شوق سے ہے عیشِ دوامی دیتی
سطحِ کاغذ پہ تو اک باغ کھلا دیتی ہے — برگ و بار اس میں مرادوں کے لگا دیتی ہے
عوضِ آب ہے دیتی اُسے تو آبِ حیات — اور دکھا دیتی ہے اس ظرف سے ثباتِ حیات

شہرۂ گلزار زمانے میں ہے عام اُن کا | پتّے پتّے پہ سدا نقش رہے نام اُن کا

کبھی طیّار لیاقت کے ہے تمغے کرتی | کہیں ایم اے ہے بناتی کہیں بی اے کرتی
بر سرِ کرسیِ دربار بٹھاتی ہے انہیں | خلعت بو قلموں لا کے پہناتی ہے انہیں
بزم کو جلوۂ رنگیں سے ہے دکھاتی اُن کے | اس طرح فخر سے دامن ہے اڑاتی اُن کے
ہوتے شاداب ہیں تو لیائے فسردہ اُن سے | تازہ دم ہوتے ہیں سب کے دلِ مردہ اُن سے
کلفتِ محنت و آفت سے ہیں ہم جی جاتے | زہر کے گھونٹ ہیں شربت کی طرح پی جاتے

اک مسافر کہ ہے سرگشتہ و حیراں جاتا | دشتِ پُر خار میں ہے بے سر و ساماں جاتا
نہ کوئی بدرقہ ہے راہ بتانے کے لئے | اور نہ ہے ساتھ کوئی بوجھ بٹانے کے لئے
اس مصیبت میں ستاتی ہے اگر پیاس اُسے | رہتی پھر جان کے بچنے کی نہیں آس اُسے
طپشِ راہ سے جلتا ہے جگر سینہ میں | بجھ کے رہ جاتا ہے دل مثلِ شرر سینہ میں
دفعتہً آبِ رواں دُور نظر آتا ہے | اور وہ اس لطف سے لہراتا ہوا جاتا ہے
کہ دلِ سوختہ ہے دیکھ کے لہرا جاتا | اور خوشی سے تنِ بے دم میں ہے دم آ جاتا
دل جو تھا لوٹ رہا سینہ میں بے آبی سے | جاتا ہے بے سر و پا دوڑتا بے تابی سے
جامِ ہمّت جو اُسے تُو نے ہیں پلوائے ہوئے | کوسوں اک دم میں لئے جاتے ہیں دوڑائے ہوئے
زورِ ہمّت ہے مگر جتنا بڑھاتی جاتی | اتنا ہی آگے ہے پانی کو ہٹاتی جاتی

یاس اس وقت کی لیکن نہ خدا دکھلائے   دل مایوس کو جب اُس کے یقیں آجائے
کہ جسے آپ سمجھتا تھا نہیں آپ ہے یہ   سرِ دریائے فنا موت کا گرداب ہے یہ
یہ سمجھتے ہی ہو اندھیر جہاں آنکھوں میں   ہوں وہیں موت کے آثار عیاں آنکھوں میں
دل میں ہمّت نہ رہی جسم میں حالت نہ رہی   صورتِ نقشِ قدم ہلنے کی طاقت نہ رہی
جان پانی ہیں ہوا اٹکی ہوئی دم سینہ میں   وہ کبھی پر ضعف سے آگرہ ہے تھم سینہ میں
اس گھڑی اپنی کرامات دکھاتی ہے تو   سرِ بالیں وہ مسافر کوئی لاتی ہے تو
حضرتِ خضر کی ہے شان دکھاتا آنا   ہاتھ میں پانی کی چھاگل ہے ہلاتا آنا
اُسکے آجانے سے ہوتی ہے نجات اُس کے لئے   ہوتا ہے قطرۂ آب آبِ حیات اُس کے لئے

کرتے زاہد ہیں خدا کی جو عبادت دن رات   ترکِ دنیا سے ہیں سرگرم ریاضت دن رات
ذکرِ فردوس ہیں تو نے انہیں سنوائے ہوئے   لطف ہر دم ہیں ہی پیش نظر آئے ہوئے
رند آزاد جو ہر دم ہے گرفتارِ گناہ   بارِ عصیاں سے ہے بیچارہ گرانبارِ گناہ
نہیں جز رحمتِ حق کوئی سہارا اُس کا   تیری ہی چشم کرم پہ ہے گزارہ اُس کا
تو نہ ہووے تو تڑپ کر دل مضطر رہ جائے   وہ گنہگار تو غم سے ابھی مر کر رہ جائے

رکھتے ہیں شعر و سخن سے جو سروکار سدا   کار اربابِ جہاں سے ہیں وہ بیزار سدا
ہے شب تار تو سونے سے انہیں کام نہیں   دن کو جز فکر مضامیں کبھی آرام نہیں

لوگ آرام سے ہیں رات کو سویا کرتے / اور یہ بیٹھے دُرِ مضموں ہیں پرویا کرتے
یہ جو ہر لطف سے ہیں ہاتھ اُٹھائے بیٹھے / بلکہ دیوانوں کی صورت ہیں بنائے بیٹھے
باغ سبز اپنے تو ہر لحظہ دکھاتی ہے انہیں / مژدۂ خلعت و انعام سناتی ہے انہیں
انہیں مطلب نہیں پر اور کسی بات سے ہے / ہاں غرض ہے تو فقط اتنی تری ذات سے ہے
کہ جو آہ اُنکے دل سوختہ جاں سے نکلے / یا کوئی نالۂ موزوں کہ زباں سے نکلے
اثر درد سے ناخن بہ جگر ہووے سدا / اور جگر درد سے لبریز اثر ہووے سدا
ہووے گو اسپہ کبھی ہو آشوبِ جہاں حد سے زیاد / قول آزاد جسے کرتی ہے انہیں یوں ارشاد
کہ سخن فہم نہ گر چرخ پہ یہیں ہوئیں گے / خورد بیں ہیں تو سخنداں کبھی یہیں ہوئیں گے

داد مل جائے گی جب اور کوئی دیکھے گا
آج دیکھا نہ کسی نے تو کبھی دیکھے گا

مثنوی حُبِّ وطن

ہے قول جملہ تجربہ کارانِ فارسی / اور کہتے ہیں یہ نظم نگارانِ نازی
حبِّ وطن ز ملکِ سلیمان نکوتر است / خارِ وطن ز سنبل و ریحاں نکوتر است
سلطانِ دل کا گر یہ یہی حکم عام ہے / اور متفق اسی پہ زمانہ تمام ہے

دِلّی کہ جو ہمیشہ سے مکانِ کمال ہے   جو باکمال اس میں ہے وہ بےمثال ہے
اِک شخص واں ستار نوازی کی جان تھا   پر جان سے عزیز تھا دلّی کو جانتا
آیا دکن سے خلعت و زر اس کے واسطے   اور نقد بہرِ زادِ سفر اس کے واسطے
ہر چند مُنہ تو دلّی سے موڑا نہ جاتا تھا   پر ہاتھ سے یہ مال بھی چھوڑا نہ جاتا تھا
مطلب یہ ہے کہ بعد بہت قیل و قال کے   اسباب سارا راہِ سفر کا سنبھال کے
دِلّی کو یہ بھی چھوڑ کے سوئے دکن چلے   پر جیسے چھوڑ کر کوئی بُلبل چمن چلے
پہنچے مگر ابھی تھے در راج گھاٹ پر   جو دفعتہً نظر پڑی دریا کے پاٹ پر
دریا کی لہریں دیکھ کے لہرایا اُن کا دل   اور دلّی چھوڑتے ہوئے بھر آیا اُن کا دل
منہ پھیر کر نگاہ جو نہی شہر پر پڑی   جلوہ دکھاتی جامع مسجد نظر پڑی
تب وہ پیامبر کہ جو آیا دکن سے تھا   اور اُن کو لے چلا وہ چھڑا کر وطن سے تھا
دیکھا نگاہِ یاس سے اور اس سے یہ کہا   پیچھے چلیں گے پہلے مگر یہ تو دو بتا
ایسی تمہارے شہر میں جمنا ہے یا نہیں   مُنہ دیکھ کر وہ اُن کا ہنسا اور کہا نہیں
پھر سوئے شہر اشارہ کیا اور یہ کہا   مسجد بھی اس طرح کی دکھا دو گے واں بھلا
وہ شخص مُسکرایا کہ یہ کیا سوال ہے   اس خانۂ خدا کا تو ثانی محال ہے
ہے اپنی طرز میں یہ نرالی جہان سے   اُتری زمیں سے جس کی شبیہ آسمان سے
یہ بات اس کی سُنتے ہی چیں برجبیں ہوئے   اور بولے خیر ہے کہ روانہ نہیں ہوئے
جمنا نہیں ہے جامع مسجد جہاں نہیں   سُنتے بھی ہو میاں ہمیں جانا وہاں نہیں

اپنے دکن کو آپ روانہ شتاب ہوں   پر اس چمن کو چھوڑ کے ہم کیوں خراب ہوں
اور گاڑی اپنی تو بھی میاں گاڑیبان پھیر   گر اب پھرے نہ یاں سے تو قسمت کا جان پھیر
ہم اپنی دلّی چھوڑ دکن کو نہ جائیں گے   گر یاں بہت نہ کھائینگے تھوڑا ہی کھائینگے

ایسے ہی ننگ حُبِّ وطن بد نصیب ہیں   گھر میں مسافروں سے جو بدتر غریب ہیں
کہتے ہیں دکھ اُٹھانا ہو یا درد سہنا ہو   تھوڑا سا کھانا ہو پہ بنارس میں رہنا ہو
اب میں تمھیں بتاؤں کہ حُبِّ وطن ہے کیا   وہ کیا چمن ہے اور وہ ہوائے چمن ہے کیا
وہ رحمتِ خدا ہے کہ بندوں پہ عام ہے   وہ لطفِ عام جس سے جہاں شاد کام ہے
وہ نورِ مہر جس سے زمانے میں نور ہے   وہ نور ذرّہ ذرّہ پہ جس کا ظہور ہے
حُبِّ وطن ہے جلوہ اُسی نورِ پاک کا   اور روشن اُسکے نور سے عالم ہے خاک کا
ہو جس میں یہ نور تو اس کو کرن کہیں   گر دل سے جلوہ گر ہو تو حُبِّ وطن کہیں
رکھتا جو سب پہ لطف و کرم کی نگاہ ہو   اور دل سے ہر بشر کے لئے خیر خواہ ہو
آوارہ سفر ہو کہ موجود گھر میں ہو   ہاتھ اپنا جیب نفع میں ہو یا ضرر میں ہو
ہر حال میں رہیں اُسے اہلِ وطن عزیز   اور ہو دیں نیک و بد روشِ جان و تن عزیز
حُبِّ وطن کے ملک میں فرمانروا ہے وہ   تاج و سریر ہو کہ نہ ہو بادشاہ ہے وہ
اور جس وطن کی چاہ تھی یوسف کے سینہ میں   اُس کا تو نقش دیکھ لو دل کے نگینہ میں
لیکن یہ راز اہلِ حقیقت سے پوچھئے   اس کا طریق پیرِ طریقت سے پوچھئے

دل جو گھڑی کی طرح برابر ہے چل رہا — ہر دم وطن کی سمت ہے منزل بدل رہا
حب الوطن کی راہ میں گرم نفس ہے یہ — نالاں غم فراق سے مثل جرس ہے یہ
یعنی کہ پاؤں اپنے وطن کا پتہ کہاں — بلبل تھا کس چمن کا میں اور آ پھنسا کہاں

جنت سے آئے آدم و حوا زمیں پہ تھے — رکھتے جو قبضہ گلشن خلد بریں پہ تھے
میراث اپنی گلشن جنت کا باغ ہے — حق ہے اگر فراق سے دل داغ داغ ہے
پیرا فریں ہے حضرت انساں کی ذات کو — بھولے نہیں ہیں آج تلک اپنی بات کو
لیتے وطن پہ قبضہ ہیں دے دے کے جاں تلک — آخر پہنچ ہی رہتے ہیں باغ جناں تلک

آزاد خیر ہے کدھر آیا خیال ہے — تم دیتے کیا جواب ہو اور کیا سوال ہے
جانا تھا کس طرف کو قدم جا پڑا کہاں — تھا ذہن کس خیال میں اور جا لڑا کہاں
دنیا زبسکہ مزرع عقبیٰ تمام ہے — سرسبز کرنا اس میں بھی لازم کلام ہے

لکھتے ہیں اس طرح سے مورخ فرنگ کے — دانا رموز معرکہ صلح و جنگ کے
یعنی یورپ کے ملک میں دو تاجدار تھے — دونوں کے اہل ملک مگر جانثار تھے
سرحد پہ کچھ فساد تھا پر ایسا پڑ گیا — دونوں کے اتفاق کا نقشہ بگڑ گیا
آخر کو تھے جو واقف اسرار سلطنت — سمجھے بہم یہ مصلحت کار سلطنت

وہ جاں نثارِ ملک روانہ ادھر کریں — اور اپنے وہ ادھر کو وہ گرم سفر کریں
تا چار ہوں جس جگہ کہ بہم ایک بار ہوں — سرحد ملک کے وہیں قائم منار ہوں
جاں باز اس طرف کے مگر جان توڑ کر — ایسے اُڑے کہ پیچھے ہوا کو بھی چھوڑ کر
اِک حصّہ طے نہ رستہ حریفوں نے تھا کیا — یہ تین حصّے بڑھ گئے اور اُن کو جا لیا
لیکن حریف شرط کے میداں کو چھوڑ کے — بولے یہ عہدِ قول و قرار اپنا توڑ کے
دو اپنے ملک کے جو جاں نثار ہوں — پھر اب کے دو طرف سے رواں ایکبار ہوں
پر اتنی بات پہلے ہر اک شخص جان لے — اور یہ ارادہ خوب طرح دل میں ٹھان لے
یعنی جو شرط جیت کے خورسند ہوئیگا — سرحد پہ وہ زمین کا پیوند ہووے گا
جانباز آئے تھے جو ابھی راہ مار کے — حُبّ الوطن کے جوش میں بولے پکار کے
جو شرط اب لگائی ہے تم نے یہی سہی — اور بات بڑھ کہ ہوئی ہے پھر وہ ابھی سہی
پر بیچ میں نہ حیلہ حوالہ کی آڑ دو — سرحد ہماری ہو چکی بس ہم کو گاڑ دو
حاصل یہ ہے کہ دونوں اسی جا پہ اَڑ گئے — جیتے کے جیتے ملک کی سرحد پہ گڑ گئے

اور ہے لکھا مورّخِ عہدِ قدیم نے — روما پہ کی جو فوج کشی اک غنیم نے
تیار اہلِ فوج سپہ کارزار تھے — پر اہلِ ملک اُن سے سوا جاں نثار تھے
آیا حریف جب کہ نہایت قریبِ شہر — اُٹھے برائے جنگ امیر و غریبِ شہر
پر اُن میں کوکلیس جو مردِ دلیر تھا — حُبِّ وطن کے بنِ نیستاں کا شیر تھا

نکلا وہ سج کے اسلحۂ جنگ اپنے شہر سے — اور لشکرِ عدو کی طرف آیا قہر سے
دو جاں نثارِ حُبِّ وطن اور ساتھ تھے — اعدا کے خوں میں ڈوبے ہوئے جن کے ہاتھ تھے
ہے جیسا بحر لنگ کا نائی لقب یہاں — تھے ٹائیبر کو باپ کہا کرتے سب وہاں
وہ بحر نیچے شہر کے تھا اوج موج پر — پُل سے اُتر کے آئے یہ دشمن کی فوج پر
پل کا دہانہ روک کے تیغوں کے گھاٹ سے — اعدا کے خوں بہاتے رہے کاٹ کاٹ کے
اور اپنی فوج کو یہ پکارے کہ آؤ تم — حملہ تو ہم نے روک لیا پل گراؤ تم
مسمار ادھر وہ کرتے رہے پُل کو آن کر — یہ تیر و نیزے مارے گئے تان تان کر
پُل سارا ٹوٹ ٹوٹ کے دریا میں بہ گیا — اِک آدمی کا راہگذر جب کہ رہ گیا
تب کوکلیز یاروں سے بولا کہ جاؤ تم — اے میرے پیارے ہموطنو غم نہ کھاؤ تم
قسمت میں جو لکھا ہو سو ہو چھوڑ دو مجھے — تم جاؤ اور خدا کے حوالے کرو مجھے
اِک اِک رفیق جبکہ ادھر پار ہو گیا — اور پُل جو کچھ رہا تھا وہ مسمار ہو گیا
للکارا پہلے دشمنوں کو دھوم دھام سے — اور ٹائبر میں کہہ کے یہ کودا دھڑام سے
ٹالا ہے تو نے سر سے [illegible] کی تباہی کو — اے میرے باپ لیجیو اپنے سپاہی کو
دشمن کی فوج تیغیں سنبھالے ہی رہ گئی — اور موت اپنے دانت نکالے ہی رہ گئی
دیکھو تو فیضِ حُبِّ وطن اس کو کیا ملا — جھٹ چار ہاتھ مار کے پار [illegible] [illegible] ملا

گر اس ہوا میں رکھتے ہو دل لالہ زار تم — اور ہو یہ تیغ حُبِّ وطن دل افگار تم

ایرانیوں کے عہدِ کیانی کو دیکھ لو / اُس بحرِ سلطنت کی روانی کو دیکھ لو
کیا کیا مخالفوں سے بچایا ہے ملک کو / کیا کیا عروج دے کے بڑھایا ہے ملک کو
کیا کیا خجل کیا ہے سپہرِ بنفش کو / کیا کیا شکوہ دی ہے کیانی درفش کو
اعدا کے خوں سے تیغیں ہیں کیا آبدار کیں / کیا کیا وطن کے نام پہ جانیں نثار کیں
ان میں بھی نیستاں کے بہادر وہ شیر تھے / جن سے کہ اک جہاں کے زبردست زیر تھے
کرتے تھے عیش دامنِ کہسار میں کبھی / اور لوٹتے تھے سبزۂ گلزار میں کبھی
مثلِ غزال دشت میں کرتے کلیل تھے / جنگِ پلنگ و شیر انہیں بچوں کے کھیل تھے
آبِ رواں پہ لیتے بہاروں کے لطف تھے / تیر و کماں سے لیتے شکاروں کے لطف تھے
پر سنتے جب کہ شاہ بعزمِ غنیم ہے / یا یہ کہ اپنے ملک کی حالت سقیم ہے
درد و الم میں ہوں کہ نشاط و سرور میں / ہوں گھر میں یا کہ وادیِ نزدیک و دور میں
جس حال میں ہوں سب سر و پا اُٹھ کے دوڑتے / روئے زمیں پہ مثلِ ہوا اُٹھ کے دوڑتے

اور اُن میں شان رستمِ دستاں کی دیکھیے / اُلفت وطن سے شیرِ نیستاں کی دیکھیے
وہ جس طرف سپہر کے بشکلِ بلا چلا / بولی زمیں لرز کے کدھر زلزلا چلا
وہ گرز گاؤ سر کو دھرے تاشِ زین پر / لنگر کا جس کے صدمہ ہو گاوِ زمین پر
ریشِ دو شاخ دوشِ ہوا پر اڑی ہوئی / افعی کے پیچ و خم میں وہ مونچھیں مڑی ہوئی
فولاد کا وہ خود جو کلہ تھا شیر کا / کرتا فزوں تھا دبدبہ گُرد و دلیر کا

برہیں وہ چرم شیر کا خفتاں پھنسا ہوا — اور پائے عزم ناف زمیں میں دھنسا ہوا
پا کمر پڑی وہ رخش پہ چیتے کی کھال کی — اور دوش پر شکوہ وہ گینڈے کی کھال کی
جانا چھڑانے شاہ کو مازندران میں — لڑنا وہ دیو و دد سے رہ ہفت خوان میں
وہ بار بار معرکے افراسیاب سے — ہونا ہمیشہ سینہ سپر انقلاب سے
جب گرم کارزار ہوا انھوں بہا دیئے — اور دشمنوں کے خون سے جیجوں چلا دیئے
وہ سیستاں کا شیر عجب کام کر گیا — حُبّ الوطن کے معرکہ میں نام کر گیا

ہر چند شہرۂ خلق میں رستم کا عام ہے — اور لیتا آج تک بھی ہر اک اس کا نام ہے
پر ہندوستاں دلاور فرخندہ کام تھے — حُبّ الوطن کے رستم دستان سام تھے
جب سنتے تھے کہ شاہ کہیں گرم جنگ ہے — یا جنگ سے وطن پہ ہوا عرصہ تنگ ہے
سوتے ہوں یا کہ جاگتے ہوں یا مست خواب ہوں — یا شوق میں شکار کے پا در رکاب ہوں
حُبّ الوطن کے جوش سے ہر کام چھوڑ کر — چاروں طرف سے دوڑتے تھے جان توڑ کر
[illegible] میں جنگ کے [illegible] — گرز و کمند و تیغ سے میدان رزم میں
[illegible] — اپنے وطن کے نام پہ قربان ہوتے تھے
[illegible] — [illegible] تھے اپنے شاہ کو قدموں پہ جان دیں
[illegible] — [illegible] تھے پھر کے معرکہ کارزار سے

حُبُّ الوطن ہے نور ہیں ہمشیرِ آفتاب — اور کرتا ہے ظہور بدستور آفتاب

اس کا بھی روز و شب کی طرح ہیر پھیر ہے — اک جا جو روشنی ہے تو اک جا اندھیر ہے

آج اُس کا آفتاب ہے اوج فرنگ پر — اور رات ہند کی ہے رُخ تیرہ رنگ پر

ہے کچھ حساب اور وہاں کی کتاب کا — رکھتا ورق ورق ہے نشاں آفتاب کا

جانباز ہیں تو بہرِ وطن جاں نثار ہیں — اور تیغ عزم رکھتے سدا آبدار ہیں

قائم ہو تا کہ دبدبہ اہلِ غرور پر — اور بیٹھے سکہ ملک کے نزدیک و دور پر

وہاں کچھ سمجھتے نہیں نقد و جان کو — دیتے ہیں شان اپنے وطن کے نشان کو

عالم جو علم و فضل کے ہیں جوہری بہت — ہیں دل میں رکھتے مایۂ دانشوری بہت

ٹپکا کے کوششوں کے پسینے جبیں سے ہیں — اور قطرہ قطرہ کرتے بہم ہر کہیں سے ہیں

تا ہو پئے سرابِ وطن آب جو نصیب — اپنے وطن کے واسطے ہو آبرو ..

شائستگی کے ساتھ رہ اوج کمال ہو — علم و ہنر میں اپنا وطن بے مثال ہو

تاجر کہ وہ بھی عقل کے سرمایہ دار ہیں — ہر چند فکر مال میں لیل و نہار ہیں

کھوتے وطن کے نام پہ ہیں مال و جان کو — طے کرتے ہیں پیادے سیاحت جہان کو

لیکن نہ یاد گھر ہے نہ ہے فکر زرا انہیں — حُبّ الوطن کا نقش ہے پیش نظر انہیں

کرتے ہیں دانہ دانہ بہم توشہ خوشے سے — اور ذرہ ذرہ ڈھونڈتے ہیں گوشے گوشے سے

پُھنتے ہیں ساتھ ہال کے علم و ہنر کے پھول ‏ ‏ تا گلشن وطن میں کھلیں سیم و زر کے پھول
دولت کا ہو شگفتہ وطن میں چمن سدا ‏ ‏ اور اس سے بہرہ یاب ہوں اہل وطن سدا

ایسے بھی اُن میں صاحب بخت و نصیب ہیں ‏ ‏ دار الشفا جُنبِ وطن میں طبیب ہیں
عالم میں بہر تجربہ پھرتے ہیں گشت کو ‏ ‏ اک اک قدم میں ماپتے وہ کوہ و دشت کو
ہیں ذرہ ذرہ چھانتے دریا و کان کا ‏ ‏ ہیں برگ برگ دیکھتے باغ جہان کا
ہیں گاہ گاہ ڈال میں گہ پات پات میں ‏ ‏ ہے غور بات بات کی ذات و صفات میں
اک اک ورق میں صورت تحریر دیکھتے ‏ ‏ اور اس میں برگ برگ کی تاثیر دیکھتے
تا نکلے کوئی تازہ مداوا گزند کا ‏ ‏ اور ہو دوائے درد کسی دردمند کا
پر اُن میں وہ ہے زینتِ تاج و نگیں سدا ‏ ‏ اور زیب سر ہیں اُسکے گلِ آفریں سدا
لایا جو بحر و بر کے سفر کو نہ دھیان میں ‏ ‏ آیا وطن کو چھوڑ کے ہندوستان میں

فرخ سیر تھا ہند میں فرمانروائے ملک ‏ ‏ اور غیرت نسیم و صبا تھی ہوائے ملک
پر ہند پر تھا حادثہ غم عجب پڑا ‏ ‏ یعنی کہ بادشاہ تھا خود جاں بلب پڑا
اس طرح کا فتور پڑا تھا مزاج میں ‏ ‏ تھا مبتلا وہ ایک مرضِ لا علاج میں
سب اہلِ عقل ہوش و حواس اپنے کھو چکے ‏ ‏ سارے طبیب ہاتھ علاج سے دھو چکے
پر اس مسیح دم نے جو آکر کیا علاج ‏ ‏ ایسا بحسب طبع موافق پڑا علاج

گویا دوا بہ کارِ دعا ہو گئی اُسے ۔ اور تین چار دن میں شفا ہو گئی اُسے

نوبت خوشی کی بج گئی سارے جہان میں ۔ اور جان تازہ آگئی اِک اِک کی جان میں

فرخ سیر کہ شاہِ سخاوت مآب تھا ۔ بحرِ کرم کا جس کے جھکولا سحاب تھا

اِک جشنِ عام اُس نے کیا دھوم دھام سے ۔ اور شورِ تہنیت کا اُٹھا خاص و عام سے

حاضر ہوئے امیر و وزیر آ کے سامنے ۔ اور اس طبیب کو کہا بلوا کے سامنے

لا دامنِ اُمید کہ بھر دیں ابھی اُسے ۔ تا عمر بھر نہ پائیے تو خالی کبھی اُسے

دریا دلی طبیب کی دیکھو مگر ذرا ۔ ڈالی نہ اُس نے لعل و گہر پر نظر ذرا

حُبّ الوطن کے جوش سے بیتاب ہو گیا ۔ دل آب ہو کے سینے میں سیماب ہو گیا

کی عرض ہاتھ جوڑ کے خدمت میں شاہ کی ۔ بندہ کو آرزو نہیں کچھ عز و جاہ کی

زر کی ہوس نہ مال کی ہے جستجو مجھے ۔ پر آرزو جو ہے تو یہی آرزو مجھے

کچھ ایسا میرے واسطے انعام عام ہو ۔ جس سے مرا تمام وطن شاد کام ہو

بولا یہ شاہ اس کا بھی تجھ پر مدار ہے ۔ جو مانگتا ہے مانگ اب تجھے اختیار ہے

تب عرض کی طبیب نے یوں بادشاہ سے ۔ روشن جلالِ شاہ ہو خورشید و ماہ سے

تھوڑی زمیں نواحئ دریا کنار میں ۔ مجھ کو عطا ہو مملکتِ شہریار میں

تا اس طرف جو میرے وطن کے جہاز آئیں ۔ اور اُن میں تاجرانِ ذوی الامتیاز آئیں

کچھ اُن پہ ہووے راہ نہ بیم و زوال کو ۔ آرام سے اُتاریں یہاں اپنے مال کو

اور جنس جو کہ لائیں وہ نزدیک دُور سے ۔ محصول سب معاف ہو اس کا حضور سے

پہلا علاج گرچہ بہت کارگر پڑا — یہ نسخہ لیکن اُس سے سوا پُر اثر پڑا
اس کی کبھی یعنی کلفتِ غم دُور ہوگئی — اور تھی جو کچھ کہ بات وہ منظور ہوگئی
ہر چند اُسے نہ فائدہ سیم و زر ہوا — پر نفع بہرِ اہلِ وطن کس قدر ہوا
امن میں اِک عطائے خداداد پڑ گئی — اور سلطنت کی ہند میں بنیاد پڑ گئی
نوبت بجا کرے گی سدا صبح و شام کی — آواز دیں گے طبل نگراں کے نام کی

اے آفتابِ حُبِّ وطن تو کدھر ہے آج — تو ہے کدھر کہ کچھ نہیں آتا نظر ہے آج
تجھ بن جہاں ہے آنکھوں میں اندھیر ہو رہا — اور انتظامِ دل زبر و زیر ہو رہا
تجھ بن سب اہلِ درد ہیں دل مردہ ہو رہے — اور دل کے شوق سینہ میں افسردہ ہو رہے
ٹھنڈے ہیں کیوں دلوں میں ترے جوش ہو گئے — کیوں سب ترے چراغ ہیں خاموش ہو گئے
حُبِّ وطن کی جنس کا ہے قحط سال کیوں — حیراں ہوں آج کل ہے پڑا اس کا کال کیوں
کچھ ہو گیا زمانے کا اُلٹا چلن یہاں — حُبُّ الوطن کے بدلے ہے بغض الوطن یہاں
بن تیرے ملکِ ہند کے گھر بے چراغ ہیں — جلنے عوض چراغوں کے سینوں میں داغ ہیں
کب تک شبِ سیاہ میں عالم تباہ ہو — اے آفتاب ادھر بھی کرم کی نگاہ ہو
عالم سے تاکہ تیرگیِ دل دُور ہو تمام — اور ہند تیرے نور سے معمور ہو مدام
اُلفت سے گرم سب کے دل سرد ہوں بہم — اور جو کہ ہم وطن ہوں وہ ہمدرد ہوں بہم
تا ہو وطن میں اپنے زر و مال کا وفور — اور مملکت میں دولت و اقبال کا وفور

سب اپنے حاکموں کے لئے جاں نثار ہوں — اور گردنِ حریف پہ خنجر کی دھار ہوں
علم و ہنر سے خلق کو رونق دیا کریں — اور انجمن میں بیٹھ کے جلسے کیا کریں
لبریز جوشِ حبِّ وطن سب کے جام ہوں
سرشارِ ذوق و شوق دلِ خاص و عام ہوں

مثنوی خوابِ امن

تھک کے خورشید نے دم کل جو سرِ شام لیا — دل نے بھی کرسیِ آرام پہ آرام لیا
میں کہ دن بھر کی مصیبت سے تھکا ماندہ تھا — مکتبِ دہر کا پرشائقِ ناخواندہ تھا
دمبدم دورِ فلک تازہ سبق تھے گویا — رات دن مجھ کو زمانے کے ورق تھے گویا
شبنمِ امن و اماں سے کبھی شاداب جہاں — اور کبھی شعلۂ آفات سے بیتاب جہاں
بود و نابود ہو نظروں میں پھرے جاتے تھے — معنیِ کون و فساد اس میں کھلے جاتے تھے
دفعتاً سامنے لیلائے شبِ تار آئی — کرتی اک اک کو مے شوق سے سرشار آئی
گرچہ لائی تھی نہ سامان مے و مے نوشی کا — ہاتھ میں شیشہ تھا پر دارو بے ہوشی کا
چال میں سرمۂ حیرت کے غبار اٹھتے تھے — حال سے دیدۂ غفلت کے خمار اٹھتے تھے
ایسے انداز سے دامن کو ہلاتی آئی — سب کو بھی امن کے سائے میں سلاتی آئی

اس کا جھونکا ہوا غفلت کا حجاب آنکھوں پر
خواب شیریں نے کیا کارِ نقاب آنکھوں پر

خواب گو کارِ جہاں میں خلل انداز ہوا
پر خیالات دلی کو مرے پرواز ہوا

ذوقِ گلگشت کا اک دے کے اشارہ مجھ کو
ایسے گلزاروں میں لیجا کے اتارا مجھ کو

کہ نہ تھا فصلِ بہاری پہ سہارا اُن کا
تھا چمن بند طبیعت چمن آرا اُن کا

اُس قلمرو میں رواں تھا قلمِ امن اماں
پتے پتے کے ورق پر رقمِ امن واماں

پانی نہروں میں پڑا بہتا تھا اور شور نہ تھا
موجیں بھی دست و گریباں تھیں مگر زور نہ تھا

سرکشی سروِ سرافراز دکھاتے ہی نہ تھے
سینہ زوری کے بگولے ادھر آتے ہی نہ تھے

زلفِ سنبل کی سیاہ تھی پہ سیہ کار نہ تھی
خم تو تھے اس میں مگر پیچ سے خمدار نہ تھی

سرِ شمشاد کا طرہ وہاں طرار نہ تھا
شوخیِ چشم سے نرگس کو سروکار نہ تھا

دھوپ کا رنگ چمکتا تھا تو ٹل جاتی تھی
اور نسیم آکے دبے پاؤں نکل جاتی تھی

صبح یہ تاب نہ رکھتی تھی کہ دم مار سکے
یا صبا پاؤں کی آہٹ سے قدم مار سکے

پر جب آتی تو شگوفہ بھی نیا لاتی تھی
ایسا کچھ پھونک کے کانوں میں چلی جاتی تھی

ہنستے تھے پھول پہ کھلتی گرہِ راز نہ تھی
لوٹ جاتے تھے نکلتی مگر آواز نہ تھی

مرغ واں نغمۂ بے صوت و صدا گاتے تھے
اور شجر موج ہوائیں پڑے لہراتے تھے

برگ سے برگ ولیکن نہ کھڑک سکتا تھا
خار کی نوک میں دامن نہ اٹک سکتا تھا

وریاں دیتے تھے نغموں میں پرندے سارے
سوتے آرام سے تھے عیش کے بندے سارے

اغباں قدرتِ حق کا جو تھا آیا اس جا
تختہ اک تھا گلِ خودرو کا لگایا اس جا

دامن کوہ سے چشمہ جو ہوا تھا جاری
آبِ شیریں سے پڑا کرتا تھا شیریں کاری
اس پہ جھرمٹ ہیں درختوں کے لبِ جو کی بہار
اور لبِ جُو پہ وہیں سبزۂ خود رو کی بہار
شیر بکری وہاں اِک گھاٹ تھے پانی پیتے
جامِ اُلفت تھے بہم دشمنِ جانی پیتے
جلوہ گر بیچ میں اک قلعۂ شاہنشاہی
گنبدِ امن تھا یا گنبدِ نسیمِ الٰہی

دروِ دریاں کی ضرورت تھی نہ زنہار وہاں
پاسباں امن کا دن رات تھا ہشیار وہاں

خسروِ امن کا دربار

مَیں کہ آشوبِ جہاں سے تھا ستمدیدہ بہت
امن کو سمجھا غنیمت دلِ غمدیدہ بہت
شوقِ دل لے کے غرض قصر میں آیا مجھ کو
پر عجب عالمِ نیرنگ دکھایا مجھ
خسروِ امن تھا واں جلوہ فزائے دربار
دیتی فرصت تھی دل و جاں کو ہوائے دربار
اس کے آگے تھا مرادوں کا چمن پھول رہا
آپ تھا پھولوں کے جھبے لیے میں پڑا جھول رہا
نیند کا جھوکا تھا جھبے کو جھلاتا جاتا
مورچھل سر پہ تھا آرام ہلاتا جاتا
گل خورشید تھا واں ہر گلِ شاداب سدا
دُھوپ کی جا تھی مگر چادرِ مہتاب سدا
صبح دن رات کھڑی سامنے ہنستی تھی وہاں
نور کے ساتھ سدا اوس برستی تھی وہاں

بجتے باجے تھے یہیں اور یں وہاں ہر دم آگئے
آرزوئیں تھیں کھڑی ناچتی چھم چھم آگے

دولت و عیش و طرب سے تھے آراستے دربار
گیت تھے نغمہ بستہ جملہ برائے دربار

دل میں انکے پریشاں کا نہ تھا نام و نشاں
باغ تھے بیت خاطر کے تھے سب کام وہاں

مرغزاروں میں جو اشجار تھے سب پھیلائے تھے
دامن امن و امان خلق پہ پھیلائے ہوئے

شغل میں اپنے ہر اک شخص تھا مشغول یہاں
چنتا تھا راحت آرام کے پھل پھول وہاں

علم اس کا شکریہ کرتا ہے

دفعتہً دیکھا کہ اک پیر کہن سال آئے
پر عجب شان سے اک مرد خوش اعمال آئے

چشم پُر نور میں پہنے ہوئے جامہ کالا
بر میں جبہ عربی سر پہ عمامہ کالا

پاؤں تک شملہ دستار جو آ جاتا ہے
اُن کے مقدار فضیلت کو بتا جاتا تھا

لاغری چہرے پہ ہرچند کہ چھائی تھی بہت
رخ کی عینک نے مگر شان بڑھائی تھی بہت

شانہ تھا ریش مقدس میں گیا پیری نے
تھا ہاتھ اب بڑھاپے کی زمیں گیری نے

ساتھ کچھ لوگ کتابیں تھے اُٹھائے آتے
اور بغل میں کئی جزدان دبائے آتے

ان کے پیچھے سب ... تی و صفا آتے تھے
ٹیکتے آپ کرامت کا عصا آتے تھے

232500

... یا وثیقے ... کے آگے آتے
پہلے سب نے یہ اپنا دستور دیا پھیلا کے

... کی ... آ کے ہیں کمالات کے لئے
علم نے بھیجا ہے اقلیم رسالت کے لئے

... تصنیف میں ہیں مصروف سدا
سچ ہے ہر اک شہرت تعریف سے مصروف جدا

... تبدیل کو ... کے سوا کام نہیں
اور یہاں ہیں انہیں فکر پریشانی نہیں

... علم ہے کرنا عمل ایجاد سے
آ گئے ہیں کارگہ دہر میں استاد سے

... تدبیروں سے جو پہنچے ہیں کام ہر کار
ہیں یہ جمعیت خاطر کی ہی باتیں ساری

... چاہئے موجود ہیں سارے ساماں
ملتے ہیں پہلے ضرورت سے ہی سارے ساماں

استفادہ ... یہ سب فیض کرم تیرے ہیں
کشور علم میں سب بہرہ ہے دم تیرے ہیں

تو نہ ہوتا تو ابھی خلق میں طوفاں ہو جاتے
سب کا شیرازہ اوراق پریشاں ہو جاتا

زراعت شکر کی ہے

تنہا انہوں نے ابھی دفتر نہ سمیٹا اپنا
اور نہ تنہا علم نے طومار لپیٹا اپنا

دیکھا انبوہ ... سے زیادہ آتا
بے سوار ان میں کوئی کوئی پیادہ آتا

گھوڑیاں آ کے سواری ہیں ... پیچھے
اور کوئی بیل لئے آتے ہیں گھیرے پیچھے

گود میں اپنے کوئی گوسالہ اٹھائے آتا
کوئی ہل اپنا بغل میں ہے دبائے آتا

نذر کے ٹوکرے کندھوں پہ دھرے آتے ہیں　نئی فصلوں کے اناج ان میں بھرے آتے ہیں
طرّے اعزاز کے جن لوگوں نے ہیں پائے ہوئے　بالیں گیہوں کی وہ پگڑی میں لٹکائے ہوئے
ہمّت و عزم میں بوڑھے بھی جواں ہیں اُن کے　تندرستی کے نشاں منہ پہ عیاں ہیں اُن کے
دیکھو انہیں سب کھلاہٹ کے کنارے آئے　بے تکلّف سرِ دربار وہ سارے آتے
اور کہا سب نے کہ اے بادشہ امن و اماں　تجھ سے جاری ہے زمانے میں رہِ امن و اماں
کر کے طے گھر سے بہت فرسخ و میل آئے ہیں　جانبِ اہلِ زراعت سے وکیل آئے ہیں
کہ وہ صحرا میں جو ہیں بیٹھے سہارے تیرے　آسرے رکھتے ہیں دن رات بچارے تیرے
کھیت پر بیٹھے ہوئے ہیں تو دعا کرتے ہیں　گھر میں ہیں تو ترا شکرانہ ادا کرتے ہیں
تو وہ نیساں ہے کہ جس کھیت پہ آجاتا ہے　خاک پر آبِ زمرّد کو بہا جاتا ہے
کشتِ امّید زمانے کی ہری ہے تجھ سے　سبز کھیتوں کی سدا گود بھری ہے تجھ سے
پیرِ دہقاں کہ جو ہے سائے میں تیرے بیٹھا　جان و مال اپنا ہے مٹی میں بکھیرے بیٹھا
سایۂ امن ترا اس کو ہرا رکھتا ہے　صرصرِ فتنہ سے محفوظ سدا رکھتا ہے
تو بچاتا ہے زمانے کی لگدکوبی سے　ترکتازانِ حوادث کی پُرآشوبی سے
فیضِ رحمت ترا ہر لحظہ بڑھاتا ہے اُسے　زور تیرا ہے کہ زر کر کے اُٹھاتا ہے اُسے
کرتا خرمن ہے تو ہی بکھرے ہوئے دانوں کو　تو ہی اک دانے سے ہے پالتا سو دانوں کو

تو نہ ہووے تو ہرے کھیت ہوں پامال تمام
دم میں ہو خلقِ خدا کال سے بدحال تمام

تجارت شکریہ کرتی ہے

سخن اُن کا نہ سرِ خاتمہ آیا تھا ابھی — اور زراعت نے یہ خرمن نہ اُٹھایا تھا ابھی
لوگ کچھ اور بھی آتے پئے تقریر وہاں — دشت و دریا کی لگے کھینچنے تصویر وہاں
گرچہ حال اپنا زباں سے نہ بتاتے تھے وہ سب — مگر انداز سے ایسے نظر آتے تھے وہ سب
کہ ابھی قطع کئے راہِ سفر آئے ہیں — ریل سے یا کہ جہازوں سے اُتر آئے ہیں
تھا کوئی دوش پہ خُرجین اُٹھائے آتا — اور بغل میں کوئی بیگ اپنا دبائے آتا
رنگ سنولائے ہوئے چہرے تھے گرد آلودہ — دل تھے کلفت زدہ اور سینے تھے درد آلودہ
دشت و دریا کے عجائب تھے وہ ہمراہ لئے — تحفے ہر ملک کے ہاتھوں میں پئے شاہ لئے
خسروِ امن کے دربار میں جب آئے وہ — بعد آداب زباں پر یہ سخن لائے وہ
اے شہِ امن دُعا خلق دعا کرتی ہے — اور تجارت ترا شکرانہ ادا کرتی ہے
کہ ترے نظم و نسق سے جو ہیں رستے جاری — شرق سے غرب میں جنسیں ہیں پہنچتی ساری
ہم اُٹھا لیتے ہیں نفع درم و دام اُن سے — اور جو گھر بیٹھے ہیں وہ پاتے ہیں آرام اُن سے
کاروانوں کے شب و روز جو ہیں تار لگے — کوہ و صحرا میں جہاں دیکھو ہیں بازار لگے
رہے جس جا پہ مسافر کے لئے گھر ہے وہیں — شیرِ گنجشک جو چاہو تو میسر ہے وہیں
نہیں اصلا خطرِ رہزنئ دہر انہیں — ہے ترے فیض سے ہر دشت و جبل شہر انہیں

کوئی دم لیتا ہے رستے ہیں کوئی سوتا ہے   پر کہیں کیل کا کھٹکا بھی نہیں ہوتا ہے
اے شہ امن اگر لطف ترا عام نہ ہو   اور ترے سب نظم پہ عالم کا سرانجام نہ ہو
ابھی بازارِ جہاں زیر و زبر ہو جائے
خانۂ امن و اماں موت کا گھر ہو جائے

صنعت دستکاری

تھی یہ بات انکی ابھی ختم پہ آنے پائی   اور تجارت یہ کہاں تھی نہ بڑھانے پائی
لوگ کچھ سامنے سے اور نمودار ہوئے   لیکن اس رنگ سے وہ داخلِ دربار ہوئے
جیسے تحفہ ہو گلِ بوقلموں کا آنا   یا چمن ہو کوئی نیرنگ و فسوں کا آتا
خاک پر تھے گلِ ایجاد لگاتے آتے   پھول جھڑتے تھے جو تھے ہاتھ ہلاتے آتے
دستکاری نے کیا لعبتِ چیں تھا انکو   رنگ چمکا کے کیا نقشِ نگیں تھا انکو
چشمِ صنعت سے جو تھے کام بنائے اکثر   ضعفِ بینائی سے عینک تھے لگائے اکثر
تھے لئے نذر نہ کچھ گوہر و زر ہاتھوں میں   دستِ صنعت کے تھے گلدستہ تر ہاتھوں میں
غرض آکر سرِ تسلیم جھکائے سب نے   پیشکش لے کے جو آئے تھے دکھائے سب نے
کر چکے شاہ کا جس دم حقِ نذرانہ ادا   تب کیا جانبِ صنعت سے یہ شکرانہ ادا

ے شہِ امن ہمیشہ ہو یہ دربار کھلا | کہ اسی سائے میں اپنا بھی ہے بازار کھلا
وستکاری کے عمل تجھ سے ہیں سارے چلتے | کام سب تیری ہی بدولت ہیں یہ ہاتھ چلاتے
تار ہے غیب کے اخبار سناتے جاتا | ریل کا تختِ سلیماں ہے اُڑائے جاتا
کارخانے جو بڑے چلتے ہیں دن رات یہاں | اور کلیں کر رہی جو جو ہیں طلسمات یہاں

اے شہِ امن یہ تیری ہی ہے برکت ساری
تیرے زوروں کی کلوں میں یہ ہے حرکت ساری

دولت شکریہ کرتی ہے

سلسلہ صنع و صناعت کا ابھی تھا جاری | زر تقریر پہ سنتے کر رہے مینا کاری
دفعتہً چاندنی دربار پہ چھائی یکسر | ہو گئے سب در و دیوار طلائی یکسر
جیسے جھڑتے کبھی گلبن سے ہیں گلزار میں پھول | چاندی سونے کے برسنے لگے دربار میں پھول
کہ پری اتنے میں اک دوشِ ہوا سے آئی | آئی لیکن عجب انداز و ادا سے آئی
حسنِ رفتار سے تھی سرعتِ سیماب اُڑتی | جائے دامن تھی فقط چادرِ مہتاب اُڑتی
حسن تھا گرچہ حقیقت میں ہوائی اُس کا | پر سراپا تنِ نازک تھا طلائی اُس کا
ٹھوکروں میں تھی زر و سیم اُڑاتی چلتی | باغ نرگس دمِ رفتار کھلاتی چلتی

[illegible] آب تھا | [illegible] تھا
[illegible] آئینہ | [illegible] آئینہ
[illegible] | حسن [illegible] دلکش [illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible] | اپنا [illegible] زبردستی ہے
[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible] نشانوں سے

[illegible] عالم
[illegible] عالم

فتنہ انگیزی غدر و آشوب کی

تھی پری زمزمہ سنج سے دمساز ابھی | کہ عیاں جانب صحرا سے اک آواز ہوئی
وہ صدا سنتے ہی فق ہو گیا دربار کا رنگ | اور ہوا ہو گیا یکسر گل و گلزار کا رنگ
اہل دربار کھڑے بزم تماشے بیٹھے | غم و افکار سے ہاتھ اپنے اٹھائے بیٹھے

مضطرب ہو کے ہر اک جانب آواز چلا
مرغِ دل میرا بھی کھولے پر پرواز چلا

چلتے چلتے غرض اک دشت نظر آیا ہمیں
ماجرا دیدۂ عبرت نے یہ دکھلایا ہمیں

یعنی اک مردِ دلاور ہے سرکوہ کھڑا
اور سرکوہ ہے گرد اسکے اک انبوہ کھڑا

تمتمائے ہوئے ہیں دھوپ سے رخسار اسکے
لال انگارے ہیں دو دیدۂ خونخوار اسکے

بدن اینٹھا ہوا ابھرا ہوا سینہ اس کا
کہ سدا مشقِ مشقّت سے ہے قرینہ اس کا

خسروِ امن سے ہے بسکہ بندھی لاگ اسکی
کودا گھوڑے سے ہے اور پکڑے ہے خود باگ اسکی

نیزہ ٹیکے ہوئے ہے سب پہ نظر ڈال رہا
ہر نظر سے ہے شرارت کے شرر ڈال رہا

اور یہ کہتا ہے کہ اے امن کے بندو آؤ
آؤ اے راحت و آرام پسندو آؤ

آؤ۔ جلد آؤ کہ ہم مرد بنائیں تم کو
جامِ جرأت خمِ ہمّت سے پلائیں تم کو

کر دیا سلطنتِ امن نے بزدل ہے تمہیں
نہ رکھا عیش و طرب نے کسی قابل ہے تمہیں

رات دن رہتے ہو آرام کے سامانوں میں
دن کو گلشن میں ہو اور شب کو شبستانوں میں

خوابِ غفلت میں ہو تم پاؤں پسارے سوتے
ہمّت و عزم بھی ہیں ساتھ تمہارے سوتے

جرأت و حوصلہ سے تم کو رہا کام نہیں
ملک میں زور ترقی کا کہیں نام نہیں

خسروِ امن کی خدمت میں زمیں چومتے ہو
رات دن بیٹھے افیمی کی طرح جھومتے ہو

اس عمل نے ہے جوانی میں کیا پیر تمہیں
کیا ابے قید ہے وابستۂ زنجیر تمہیں

آؤ اس قیدِ بلا سے تمہیں آزاد کروں
اور ابھی صاحبِ اقبال خداداد کروں

زورِ بازو سے ہے تم آفاق کو تسخیر کرو	دستِ تقدیر کو وابستۂ تدبیر کرو
عیش نے ہے جو تمہیں جہان سے رنجور کیا	ضعفِ دل نے تمہیں ہمت سے ہے معذور کیا
کر دیا امن نے جو عیش کا پابند تمہیں	اور کیا بسترِ راحت کا ہے پیوند تمہیں
مَیں جہانگیرِ جہاں گرد کروں گا تم کو	مرد اگر ہو تو جواں مرد کروں گا تم کو
ماپ ڈالو گے انہیں قدموں سے میدانِ جہاں	ایک کر دو گے ابھی دشت و بیابانِ جہاں
اپنے ہر کام کو آرام میں کھویا تم نے	ملک کا نام زمانے میں ڈبویا تم نے
مَیں ابھی خاک سے افلاک پہ پہنچاؤں گا	مثلِ خورشید جہاں میں تمہیں چمکاؤں گا
گرچہ تھا خلق میں آشوبِ جہاں نام اُس کا	فتنہ انگیزیِ عالم تھا سدا کام اُس کا
پر شہِ امن کے بندے تھے جو بھولے بھالے	گنبدِ امن میں آرام سے سونے والے
گرم و سردِ اُن پہ زمانے کے نہ گذرے تھے کبھی	گود سے دایۂ راحت کی نہ اترے تھے کبھی
لایا تھا پیچ میں اپنے نہ کبھی غدر انہیں	اور نہ تھی سلطنتِ امن کی کچھ قدر انہیں
اس کی جانب قدمِ شوق بڑھائے سب نے	اور ادب سے سرِ تسلیم جھکائے سب نے
یعنی ہم تابعِ فرماں ہیں جدھر جائیے آپ	جان تک دینے کو حاضر ہیں جو فرمائیے آپ
ان میں جو کوتہی فہم جو پائی اس نے	مکر کے ہاتھ کو دی اور رسائی اس نے
پہلے نزدیک اشارے سے بلایا اُن کو	جھک کے پھر کان میں یہ نکتہ سنایا اُن کو
کہ شہِ امن سے ہو شہر نہ خالی جب تک	ملک پائیگا تمہارا نہ بحالی جب تک
در مدد اس میں تمہاری بھی ہے درکار ضرور	چاہیئے میری رفاقت تمہیں اک بار ضرور

سب نے سینوں پہ رکھے ہاتھ کہ ہم حاضر ہیں
اور جہاں آپ قدم ماریئے دم حاضر ہیں

یہ سخن سنتے ہی اک قہقہہ مارا اس نے
اور کیا شہر کی جانب کو اشارا اس نے

دوڑ کر جست کی اور زینتِ رہوار ہوا
آتشِ فتنہ سے عالم پہ شرر بار ہوا

شہر کی سمت کو رخ اس نے دلیرانہ کیا
ایسا للکار کے اک نعرۂ شیرانہ کیا

ہل گئے صدمے سے جس کے طبقِ خاک تمام
تھرتھرانے لگے نہ گنبدِ افلاک تمام

یہ بلا شورِ قیامت جو نمودار ہوا
دفعتہً چونک کے میں خواب سے بیدار ہوا

کھل گئی آنکھ تو تھی شامِ سیہ فام وہی
وہی آزاد تھا اور کرسیِ آرام وہی

مثنوی موسوم بہ دادِ انصاف

تھا دل آشفتہ جو شب گردشِ ایام سے میں
ہو گیا بے خواب اٹھا بسترِ آرام سے میں

دل تھا حق تلفیوں سے چرخ کی بیزار مرا
اس کی بیداد سے برہم تھا دلِ زار مرا

جاگتے جاگتے وحشت سے جو گھبرایا میں
اور شبِ تار کی تنہائی سے تنگ آیا میں

جیب میں عقل کی کنجی کو ٹٹولا میں نے
اور کتب خانہ خیالات کا کھولا میں نے

وہ کتب خانہ کہ جو علم کا گنجینہ تھا
یا کہ رودادِ زمانہ کا اک آئینہ تھا

کتبِ عہدِ قدیم اس میں سجائی تھیں بہت — عہدِ آیندہ کی تصنیف بٹھائی تھیں بہت
بہت اوراقِ پریشاں کہ جو تھے ان میں — ماضی و حال کے احوال رقم تھے ان میں
تھے پڑے دفترِ تاریخ کے انبار بہت — اور نسب ناموں کے بھی تھے ہوئے طومار بہت
انہیں اوراق میں اک تھا جو نسب نامہ ملا — کہ تھا جب مخزنِ اسرار پہ تھے خامہ ملا
سر بسر تھے رقم احوال کو فال اس میں — خاندانِ شہِ انصاف کے تھے حال اس میں

معدنِ روشن کہ آفاق میں تھا باپ اس کا — چہرہ پر باپ کے روشن تھا سو آپ اس کا
تھا نسب اس کے بزرگوں کا یقیں سے ملتا — حق و انصاف کا بھی رشتہ تھا دیں سے ملتا
ہر شرف کا غرض اس گھر سے پتہ ملتا تھا — رشتہ رشتہ یونہی ایمان سے جا ملتا تھا

ماں کی جانب میں دیانت کا تو فرزند تھا وہ — اور امانت کے کلیجے کا جگر بند تھا وہ
دانشِ خداداد نے وہ اپنا پلایا تھا اسے — حسنِ اعمال نے گودوں میں کھلایا تھا اسے
اس نے جب ہوش سنبھالا تو بہت شاد ہوئے — ملکِ دل خرمی و عیش سے آباد ہوئے
بعد ازاں مکتبِ تہذیب میں سب لائے اسے — تاکہ دنیا کی بھی کچھ عقل ذرا آئے اسے
یاں ادب نے اسے شائستہ و دلخواہ کیا — علم نے اس کو ہر اک راز سے آگاہ کیا
کر چکے علم و ادب جبکہ ادا حق اپنا — اور فضیلت نے کیا نائبِ مطلق اپنا
ملک القدس کے دربار میں تب لائے اسے — کہ معزز کسی اعزاز سے فرمائے اسے

سرِ دربار بصد حسن و ادب آیا وہ — ایسے آداب سے تسلیم بجا لایا وہ
کہ شہِ قدس اُسے دیکھ کے خورسند ہُوا — اور ہر اک حاضرِ دربار رضامند ہُوا

دونوں اُستاد اتالیق کے تھے ہمراہ آئے — باندھ کر دستِ ادب روبروئے شاہ آئے
کی یہ پھر عرض کہ تو خسروِ نورانی ہے — اور تجھے عالمِ بالا کی جہانبانی ہے
چاند یہ اوجِ حکومت پہ جو چمکا ہے ترے — ملتجی آج فقط مہرِ کرم کا ہے ترے
اے شہِ قدس رہے مدِّ نظر حال اس کا — ایسا چمکا ہو تو نیّرِ اقبال اس کا
کہ فزوں مہر سے ہو جائے درخشانی میں — حکم ہوا اس کا رواں کشورِ انسانی میں

خال بہ علم و ادب نے جو سب اظہار کئے — اور قیافے نے بیاں اُسکے یہ سب اطوار
خسروِ قدس نے تب موردِ اعزاز کیا — خلعتِ عزّت و عظمت سے سرافرا
اپنے اعزازِ دوامی کا دیا تاج اُس کو — اور دُعاؤں سے کیا صاحبِ افواج اُسک
مشتری نے دیا عزّت کا عمامہ اپنا — اور عطارد نے دیا ہاتھ سے خامہ اپنا
لقب خسروِ انصاف اُسے ارشاد کیا — اور روانہ سوئے کشورِ ایجاد کیا
کہ ہوا ملکِ فنا ہے جو خرابات تمام — ستم و جور کی ہے چھائی ہوئی رات تمام
جا کے آفاق سے تم نور کو پُر نور کرو — اور خراباتِ جہاں عدل سے معمور کرو

نسخۂ سیرِ خیالی تھا سرِ دست ابھی — اور نظر سلسلۂ شوق سے پابست ابھی
کہ ورق چھوٹ پڑا ہاتھ سے یکبار مرے — نیند نے بند کئے دیدۂ بیدار مرے
چھائے ایسے یہ تصوّر دلِ بیتاب میں تھے — کہ جو دل میں خیالات وہی خواب میں تھے
اس تصوّر نے غرض میرے اڑایا مجھ کو — دفعتہً ایسے بیابان میں لایا مجھ کو
وہمِ شاعر کی جہاں بات کبھی پہنچے نہ کبھی — وسعتِ فرضِ محالات کبھی پہنچے نہ کبھی

یک بیک عدل کے آثار نمودار ہوئے — اور تمام ارض و سما مطلعِ انوار ہوئے
بقعۂ نور کا اک تختِ ہوادار اترا — کہ جہانداریٔ عالم کو جہاندار اترا
تھا جلال اس کے یہ چہرے کی درخشانی میں — چلی جاتی تھی نگہ دیدۂ حیرانی میں
تاب جب تابشِ انصاف کی پائی نہ کہیں — اور ہوتی اس کی تجلّی کی سمائی نہ کہیں
پردۂ ابرِ کرم سامنے ڈالے اس نے — مگر اس پردے میں وہ رنگ نکالے اس نے
کہ اک آرام سا آنے لگا بینائی کو — اور ترقی ہوئی ہر دل کی توانائی کو
عالمِ قدس کے سب پاک نہاد آئے وہاں — بند و بست انکو جو درکار تھے فرمائے وہاں
جبکہ سلطان ہوئے سب بزمِ شہنشاہی کے — اور ہوئے نظم و نسق ماہ سے تا ماہی کے
توشۂ عدل ہوا جلوہ نمائے عالم — معتدل ہوگئی ہر بہر کے ہوائے عالم
ضعف و قوت بڑھے انداز سے یکساں آگے — اور کھڑی ہوگئی انصاف کی میزان آگے
رات دن کو یہ ہوا حکم کہ تل جائیں ابھی — نیک و بد جو ہوں زمانے میں وہ کھل جائیں ابھی

پاس ادب کھڑے سامنے منہ تکتے تھے رعب سے شاہ کے پر بات نہ کر سکتے تھے
کی تھی ماں باپ کے وصفوں سے جو تاثیر اُس نے اور پیا دایۂ دانش کا بھی تھا شیر اُس نے
چہرہ پہ رعب خداداد برستا تھا پڑا حسنِ خلق اُس کا مگر پھول سا ہنستا تھا پڑا
تھامے لیے ہاتھ میں اک تیغِ شرربار عجیب اسکے جوہر کا مگر تھا یہ کچھ اسرار عجیب
کاٹ میں بال کا چھوڑے نہ پس و پیش ذرا اور نہ ہو تول میں تل بھر کا کم و بیش ذرا
دوسرے ہاتھ میں فانوس فروزاں تھا لیے باپ نے جور و ستم آتشِ سوزاں تھا لیے
گرچہ فانوس میں تھی اسکے ہر اک بات نئی نور فانوس میں پر تھی یہ کرامات نئی
یعنی اصلیتِ اشیا کو دکھا دیتا تھا نیک و بد صورتِ آئینہ بتا دیتا تھا

الغرض خسروِ انصاف کا دربار کھلا دل پہ عالم کے درِ دولتِ بیدار کھلا
حق و اثبات چپ و راست وزیر اسکے ہوئے ذہن و ادراک و قیاس آ کے مشیر اسکے ہوئے
مصلحت باندھے ہوئے عہدِ وفا تھی اُس سے ہوتی تدبیر نہ اک آن جدا تھی اُس سے
قہر اک سمت کو جوں شعلہ بھڑک جاتا تھا رحم پر آبِ کرم آ کے چھڑک جاتا تھا
یُمن و اقبال نے چمکایا وقارِ دربار اور ہوا عظمت و شوکت پہ مدارِ دربار

کر چکے نظم و نسق آ کے جو سب تیاری تو ہوا پہلے یہ دربار سے فرماں جاری
کہ جو مظلوم ستم دیدہ بچارے ہوویں اور وہ حق تلفیوں سے ظلم کے مارے ہوویں

برسرِ وادیِ انصاف ابھی لائیں انہیں تاکہ تحقیق سے ہم داد کو پہنچائیں انہیں

شہِ انصاف کو یہ بات جو منظور ہوئی اشتہاروں کی زباں سے وہیں منظور ہوئی
گئی پر اس حکم نے دُنیا تہ و بالا گویا بلکہ گھر گھر عجب اک تہلکہ ڈالا گویا
یاس اور آس کے اور شادی و ناشادی کے تھے جو خوف و خطر آبادی و بربادی کے
تو جسے دیکھتی تھی اس کو لگی تھی اپنی پڑ گئی تھی غرض اک ایک کو اپنی اپنی
تھے جو حق تلفیوں سے لوگ دل افگار تمام آن کی آن میں مظلوم و ستمگار تمام
ہوئے اس طرح فراہم سرِ میدانِ جہاں ہو گیا حشر کا میدان بیابانِ جہاں

دوسرا حکم ہوا اور وہاں سے جاری اور ہوا خلق میں شہرت کی زباں سے جاری
کہ جدا ہوویں ہر اک فرقے کے اشخاص الگ تاکہ احکام میں بھی عام سے ہوں خاص الگ

جبکہ تعمیل سے یہ حکم عمل میں آیا تو گریبانِ ستم دستِ اجل میں آیا
پہلے اک فرقہ طلب برسرِ دربار ہوا حکم دربار اُسے اس طرح اظہار ہوا
کہ جو قبضہ میں ہو حقیت و املاک کوئی نقد یا جنس جہاں ہو تہِ افلاک کوئی
اُس پہ دعوے جسے کچھ ہو وہ بتا دیوے ابھی اور جو کچھ پاس سند ہو تو دکھا دیوے ابھی
حکم یہ سنتے ہی دوڑے سوئے دربار بہت کھلے اسناد و فرامین کے طومار بہت

آل تمغا تھے بہ طغرائے سلاطین سلف — اور مطلّا و مزیّن تھے بہ آئینِ سلف
بہت اسنادِ وثائق کے قبالے آئے — سیکڑوں مہرِ شہادت کے حوالے آئے
پر نظر جب شہِ انصاف نے ڈالی اپنی — اور وہیں ہاتھ میں فانوس سنبھالی اپنی
پھر شہادت کوئی پوچھی نہ گواہی دیکھی — اور نہ مہر و تزک دفترِ شاہی دیکھی
جو جو اسناد کہ در پیشیِ انصاف میں تھے — تھے کھلے یا کہ دھرے گوشہ و اطراف میں تھے
انقلابوں نے زمانے کے چھپایا تھا انہیں — یا کہیں خوف جرائم نے دبایا تھا انہیں
تھے وہیں زیرِ بغل یا کہ مکانوں میں چھپے — اور مکانوں میں بھی صندوقوں کے خانوں میں چھپے
روشنی پڑتے ہی احوال عیاں ہو گئے سب — جعل کے حرف جہاں تھے وہ دھواں ہو گئے سب
جعلسازوں نے یہ جب دیکھا تو گھبرائے بہم — مکر و تزویر کے پرچے وہیں دوڑائے بہم
آئی دولت بھی مگر اس کی رسائی نہ ہوئی — اور سفارش سے وہاں کارروائی نہ ہوئی
طرفہ تر لطف یہ لیکن سرِ دربار ہوئے — کہ یکایک بدل اقبال سے ادبار ہوئے
بے نوا آئے تھے جو وہ امرا ہو گئے سب — جو امیر الامرا تھے وہ گدا ہو گئے سب

الغرض حق کو پہنچ کر جو یہ حقدار آئے — تو وہ انصاف طلب بر سرِ دربار آئے
کہ خطابوں نے بنایا تھا سرافراز انہیں — دیتی القاب تھی سرمایۂ اعزاز انہیں
ان میں وہ لوگ کہ جو صاحبِ دستار بھی تھے — تن پہ چمکائے ہوئے خلعتِ زرتار بھی تھے
خاندانوں کی بزرگی نے بڑھایا تھا انہیں — یا کہ دولت کی ہواؤں نے اڑایا تھا انہیں

سب سے پہلے وہ قدم مار کے آئے آگے　　　عَلَمِ فخر جو لائے تھے بڑھائے آگے
پر جب انصاف نے فانوس اُٹھائی اپنی　　　چاندنی پرتوِ انصاف نے چھائی اپنی
تو وہ گمنام جو عالم میں سدا خوار رہے　　　اور کئے کارنمایاں تو وہ بیکار رہے
اب وہ رُخ پرتوِ اعزاز سے چمکانے لگے　　　ان کے سر پر علمِ اقبال کے لہرانے لگے
پر جو دربار میں آئے تھے سرافرازی سے　　　اب بھی باز آئے نہ ظالم وہ فسوں سازی سے
لائے تدبیر کو مطلب کی گذارش کے لئے　　　چٹھیاں لائے بہت اپنی سفارش کے لئے
حق کے آگے نہ مگر پیش کوئی بات گئی　　　ان کی جو بات تھی آخر وہ خرافات گئی
اُن کے بعد اور اک انبوہ نمودار ہُوا　　　پر عجب شان سے وہ واردِ دربار ہوّا
تھے بہت زیرِ کُلہ نخوتِ شداد لئے　　　اور بہت زیر بغل خنجرِ بیداد لئے
سینہ زوری نے انہیں سینوں میں تھے زور دیئے　　　شورہ پشتی نے انہیں تھے سرِ پُرشور دیئے
سیکڑوں بادۂ دولت کے تھے مخموران میں　　　اور بہت زورِ حکومت سے تھے مغروران میں
بادشاہوں کے بھی دربار میں تھی راہ انہیں　　　اور ہوا خواہ سمجھتا تھا ہر اک شاہ انہیں
ظلم گردوں کی طرح چھائی تھی بیداد انکی　　　کسی دربار میں سُنتے نہ تھے فریاد ان کی
اُنکے مظلوم کہ تھے ظلم کے مارے سارے　　　عدل کی آس پہ بیٹھے تھے بچارے سارے
جو ستم ان پہ ہوئے تھے وہ جتا سکتے نہ تھے　　　لب تلک نالۂ پُردرد کو لا سکتے نہ تھے
پر جو تھا خسروِ انصاف کا دربار یہاں　　　اور نہ تھا رو و رعایت سے سروکار یہاں
یا تو ہر معرکے میں تھے وہ ستمگار آگے　　　یاں مگر ہو گئے مظلوم دلِ افگار آگے

روشنی پڑتے ہی آئینہ ہوئے حال اُن کے / خود بخود کھل گئے سب قہر اعمال اُن کے
دستِ ظلم اپنے ستمگار اُٹھا بھی نہ سکے / بلکہ جو ظلم کئے تھے وہ چھپا بھی نہ سکے
قہر سے کی جو شہِ عدل نے یکبار نگاہ / ہوئی اس طرح سے ان سب پہ بشر بار نگاہ
کہ جو تھے شیر کی کھالوں میں اکڑتے آئے / اور ہوا سے دمِ رفتار جھگڑتے آئے
جامے جل جل کے وہ سب اُنکے سرِ خاک گرے / اور لفافوں سے نکل کر جو وہ بیباک گرے
رعب سے خسروِ انصاف کے تھرانے لگے / سب کے سب صورتِ روباہ نظر آنے لگے
شہ انصاف نے اُس دم یہ صدا دی سب کو / اور منادی نے وہیں آکے ندا دی سب کو
کہ جو زیراں سے تھے اب تک شہ دلیران پہ رہیں / اور مسلط وہ سدا صورتِ شیراں پہ رہیں

لوگ کچھ زمرۂ اعزازہ میں واں اور آئے / پر جو دیکھا تو نظر اُن سے عجب طور آئے
علما و فضلا و بلغا تھے سارے / اور بھرے سر میں فضیلت کی ہوا تھے سارے
تھے بہت جبہ و عمامہ شالی رکھتے / اور بظاہر تھے مٹاپے کی بحالی رکھتے
روٹیاں مسجدوں میں کھاتے تھے دن رات پڑے / مفت خوری میں بسر کرتے تھے اوقات پڑے
سر پہ دستار مشیخت کی بہت بھاری تھی / اور شکم خالی کتابوں کی اک الماری تھی
تھے مگر ایسے بھی اُن میں زدہ احوال بہت / کہ لگدکوبِ مشقت سے تھے پامال بہت
شمع ساں آتش تصنیف میں گھلتے تھے سدا / پھٹے کاغذ کی طرح خاک میں رُلتے تھے سدا
تھے پڑے بند قلمدان میں ناکامی کے / اور نکلتے تو ہدف ہوتے تھے بدنامی کے

پر ہونا منصفی دہر نے مارا تھا انہیں — سخت دشوار زمانے میں گذارا تھا انہیں
غرض انصاف نے جب پرتو ڈالا اپنا — رنگ تب معنی اصلی نے نکالا اپنا
مل گئے خاک میں اعزاز خیالی سب کے — جل گئے خلعت زرینہ و شالی سب کے

زمرۂ علم میں کچھ اور بھی اشخاص آئے — زہد و تقوے و ارادت سے باخلاص آئے
بسکہ وابستۂ طاعات و عبادات تھے وہ — خلق میں قبلۂ حاجات و مرادات تھے وہ
فقر نے مکر کی تصویر بنایا تھا انہیں — خرقہ پوشی نے مرقع میں سجایا تھا انہیں
دیتے جاروب سر خاک تھے جامے انکے — چھتریاں سر پہ لگاتے تھے عمامے انکے
سب کے سب ہاتھوں میں تسبیحیں ہلاتے آئے — عرض حال اپنے وظیفوں میں سناتے آئے
کیا پیری نے نکھارا روشن رخ نورانی کو — اور نشاں سجدے کے چمکاتے تھے پیشانی کو
پارسائی کے یہ دعوے تھے زمانے میں انہیں — تا بدربار بھی سو عذر تھے آنے میں انہیں
تھے مگر اس پہ بھی اک ایک سے آگے جاتے — اور یہ کہتے سوئے دربار تھے بھاگے جاتے
کہ زمانے کا کبھی لطف نہ پایا ہم نے — اور کچھ آرام نہ دنیا کا اٹھایا ہم نے
لٹتے دنیا کے نہ افسونِ فسانے میں کبھی — اور ہوئے عیش سے واقف نہ زمانے میں کبھی
آج سجادہ نشینی کا ہو اعزاز ہمیں — کیجئے تاجِ کرامت سے سرافراز ہمیں
جب کرامات یہ اِک اِک نے سنائی اپنی — شہ انصاف نے فانوس ہلائی اپنی
معرفت شمع فروزاں لئے یکبار آئی — کرتی اصلیتِ اشیا کو نمودار آئی

مکروتذویر ہوئے اُڑ کے ہوائی سارے | کھل گئے زہدِ خدائی و ریائی سارے
جو یہ کہتے تھے کہ دُنیا سے ہمیں کام نہیں | بلکہ عورت کا کبھی ہم نے سُنا نام نہیں
یاں جو دیکھا تو حریفِ مے و مینا نکلے | ان کے پہچاننے والے بھی وہیں آن نکلے
یعنی کچھ عورتیں کرتی ہوئی زاری دوڑیں | نان و نفقہ کی طلبگار بچاری دوڑیں
بچے کچھ گھٹنے ہوئے دوڑے کہ بابا بابا | پر یہ شرملے کھڑے تھے کہ کہیں کیا بابا
علم کی ذیل میں کچھ لوگوں نے جانا چاہا | بزمِ اعزاز میں رنگ اپنا جمانا چاہا
سندِ علم تو کچھ رکھتے نہ تھے ساتھ اپنے | خونِ معنی سے تھے البتہ بھرے ہاتھ اپنے
قتلِ مضموں نہلانے میں فقط کام اُن کا | نکتہ چینی سے تھا مشہور جہاں نام اُنکا
گرچہ شورش کے قدم آگے بڑھائے ہوئے تھے | رو سیاہی میں وہ لے منہ کو چھپائے ہوئے تھے۔
الغرض بڑھ کے یہ جس دم سرِ دربار آئے | لوگ انہیں دیکھتے ہی جوش میں یکبار آئے
اور یہ چلائے کہ ہے علم سے کیا کام انہیں | مشغلے اور ہی کچھ ہیں سحر و شام انہیں
کوئی تصنیف ہو انکی تو دکھا دیں ذرا | ہو جو تقریر کا دعوٰے تو سُنا دیں ذرا
سن کے اس بات کو اُنکے بھی ہوئے کان کھڑے | سامنے تخت کے گھبرا کے ہوئے آن کھڑے
سوچ کر ہوش و حواس اپنے سنبھالے آخر | تھے بغل میں کئی کاغذ وہ نکالے آخر
اور یہ کی عرض کہ لکھنا تو نہیں جانتے ہم | پر مٹانے میں ہیں آندھی کو بھی کم جانتے ہم
یہی باعث ہے کہ فرصت نہیں اک آن ہمیں | اس مرض نے ہے نہایت کیا حیران ہمیں
ورنہ تصنیف کریں ہم تو وہ تصنیف کریں | کہ اُسے آپ بھی گر دیکھیں تو تعریف کریں

سُن کے اس بات کو اِک قہقہہ مارا سب نے — اور کہا کاغذوں پر کر کے اشارا سب نے
کیا خرافات اُٹھا لائے ہو لیجاؤ انہیں — اور کبھی بر سرِ دربار نہ پھر لاؤ انہیں

لوگ اتنے میں بانبوہ کثیر آئے بہت — اہلِ دربار انہیں دیکھ کے گھبرائے بہت
تھے کچھ آپس میں وہ کرتے ہوئے تکرار آتے — غُل مچاتے ہوئے سب تھے سوئے دربار آتے
اہلِ سیف اہلِ قلم شاملِ حال اُن میں تھے — اور بہت تجربہ کار اہلِ کمال ان میں تھے
اُن کا غل جبکہ بہت حد سے زیادہ پہنچا — شہ کا تب حکم یہ اک لے کے پیادہ پہنچا
کہ ادب شاہ کا اتنا نہ فراموش کرو — کیوں ہو غُل اتنا مچاتے انہیں خاموش کرو
اہلِ سیف آگے بڑھے تیغِ زباں تولے ہوئے — پیش قدمی کے دلائل سے علم کھولے ہوئے
ساتھ ہی اہلِ قلم بولے یہ امکان نہیں — اور یہ آئینِ ادب میں کبھی شایان نہیں
جاہلیت کی حمیت کو نہ یاں لاؤ تم — علم سے جہل جو بڑھ جائے تو بڑھ جاؤ تم
صاحبِ تجربہ اُن میں جو شامل تھے بہت — اور وہ تدبیرِ مہمات میں کامل تھے بہت
بیچ میں آن کے چلائے کہ جانے دو انہیں — گر قدم تم سے بڑھاتے ہیں بڑھانے دو انہیں
کہ یہی سر بھی ہیں میداں میں کٹانے والے — ملک کے نام کو سر دے کے بڑھانے والے
کیا ہوا اُن سے تمہارے جو قدم پیچھے ہیں — سوئے دربار تم آگے چلو ہم پیچھے ہیں

حکم پھر خسروِ انصاف نے اِک اور دیا — اشتہاروں نے وہیں آ کے اُسے دور دیا

یعنی جو لوگ کہ خواہان مناصب ہووین اور لیاقت سے مناصب کے مناسب ہووین
سامنے خسرو انصاف کے سب آئیں ابھی اور جو اسنادِ لیاقت ہوں وہ دکھلائیں ابھی
حکم دربار یہ سن کر بہت اشخاص چلے کچھ بصد ناز چلے کچھ بصد اخلاص چلے
ان میں وہ لوگ کہ تھے دعوئے اعزاز نہیں قد و قامت کی وجاہت سے بھی تھے ناز نہیں
خلعتِ کہنہ بزرگوں کی سجاتے آئے اور خطاب انکی کتابوں سے سنلتے آئے
پر وہ دربار میں جب آئے عدالت کے لئے اور بڑھے لافِ گذاف انکی وکالت کے لئے
توشۂ عدل نے فانوس کو چمکایا ذرا نورِ تحقیق نے بھی پرتوا دکھلایا ذرا
کھل گئی انکی حقیقت تو وہ گھبرا کے ہٹے اور جو تھے آگے بڑھے پیچھے کو شرما کے ہٹے
خسرو عدل نے تب غور سے سب کو دیکھا پہلے اک اک کے حسب اور نسب کو دیکھا
جس قدر اہل شرافت نظر آئے اُن میں اور پھر اوصاف لیاقت کے بھی پائے ان میں
پاس بلوا کے بہت موردِ اعزاز کیا اور انہیں منصبِ عالی پہ سرافراز کیا
پر اک انبوہ کثیر اُن میں جو ناکام ہوا کام کا اس کے یہ مقصد نہ سرانجام ہوا
شور و فریاد سے کرنے لگا آفت برپا کیا دربار میں اک شورِ قیامت برپا
ایسے چلّائے کہ میں چونک کے بیدار ہوا لیکن اس بات سے خوش میرا دلِ زار ہوا
کہ لیاقت سے جو تھے منتخب اشخاص ہوئے میرے احباب اُن اشخاص میں تھے خاص ہوئے

سامنے جھینپتے تھے دشمن بدکیش مرے
رہے ناکام سب اعدائے بداندیش مرے

دُنیا میں ہے بگڑی ہوئی ایک ایک کی نیّت
اور خوار ہوئی بد سے فزوں نیک کی نیّت
اس واسطے سب جاہ و حشم چھوڑ کے اپنا
اور سلطنتِ خلق سے مُنہ موڑ کے اپنا
ہے چھوڑتا سب مملکت و مال کو ان کے
تا اُن کی سزا سونپ کے اعمال کو اُن کے
خود گوشۂ عزلت میں گذارہ کرے اپنا
سر خاک پہ اِک اِک یہاں مارا کرے اپنا

اتنے میں تھے جو لوگ پس و پیش پریشاں
تھے نیک و بد اُن میں بدلِ خویش پریشاں
سب مل کے فراہم ہوئے اور متصل آئے
ہر چند کہ تھے دل میں بہت منفعل آئے
لیکن تھا ہجوم ایسا بکثرت نظر آتا
تھا دل میں تصوّر یہ مرے بیشتر آتا
یارب یہ زمیں سے ہیں کہ افلاک سے آئے
یا مُردے نکل کر ہیں تہِ خاک سے آئے

اس بھیڑ میں آشوب سا اِک دفعتہً آیا
یا پانی کا ریلا کہ جو تھا موج زن آیا
جو راس و چپ ان میں تھے چپ و راس ہوئے سب
میں جن میں کھڑا دور تھا وہ پاس ہوئے سب
پہنچا تھا میں اب فاصلہ پہ مدِّ نظر کے
کی جبکہ نظر شوق کے شانوں پہ اُبھر کے
دیکھا ہوا اُستادہ ہے سلطان مروّت
کرتا ہے عیاں حالِ پریشانِ مروّت
اب کھولتا ہے تیغ کو ہمّت کی کمر سے
اور ہاتھ میں ہے افسرِ شاہی لیا سر سے
گو چشمِ غضبناک سے ہے قہر ٹپکتا
پر لب سے غم و یاس کا ہے زہر ٹپکتا
اور کہتا ہے وہ بادشہ معدلت اندیش
اِک اِک سے کہ اے فرقۂ نا عاقبت اندیش

بھیجا ملک القدس نے تھا مجھ کو جہاں میں   تا خلقِ خدا جو ہو زمیں میں کہ زماں میں
ہو دین وہی اُن کا جو ہے دینِ مروّت   اور نظم و نسق ہووے بہ آئینِ مروّت
آپس کی رفاقت سے چلیں کام سبھوں کے   نیکی سے ہوں مشہورِ جہاں نام سبھوں کے
پیدا جو خدا نے ہے کیا کون و مکاں کو   اور عالمِ اسباب بنایا ہے جہاں کو
کام ایک کا ہے ایک پہ یاں منحصر ایسا   اور اُن میں بہم سلسلہ باندھا ہے پھر ایسا
جس سلسلہ بندی کی جُدائی نہ ہو ممکن   اور ہو گئے جُدا کار روائی نہ ہو ممکن
رل مِل کے زمانے میں گذارے ہوں سبھوں کے   آپس میں مروّت پہ سہارے ہوں سبھوں کے
اور سب کو سہارا ہو خداوندِ جہاں کا   اس بن ہو گذارہ نہ زمیں کا نہ زماں کا

پر یاں تو ہیں سب بادۂ نخوت پیے بیٹھے   دعوے ہیں خدائی کے بغل میں ہیں سب بیٹھے
گزری ہوئی گردوں سے ہے گردن کشی ان کی   اور اس پہ وہ خود رائی و خود مطلبی ان کی
لے کے یہ سمجھتے ہیں خلائق کی بدی کو   اور دیکھ نہیں سکتے زمانے میں کسی کو
افسوس کہ رتبہ مرا جانا نہ کسی نے   اور میں نے جو سمجھایا وہ مانا نہ کسی نے
لیکن جو زمانہ میں یہی کام ہیں اُن کے   خود دیکھیں گے کل اُن جو کچھ انجام ہیں اُنکے
ہر چند ہیں آج اہلِ زمانہ مرے دشمن   اور چاہتے ہیں حق کو مٹانا مرے دشمن
پر ہونے دو اُن کو جو ہیں سب بر سرِ کیں یہ   جائینگے کہاں بچ کے یہیں ہیں یہیں یہ
یہ سُن کے ذرا ہوش میں ہر بے خبر آیا   اور اتنے میں اک طرفہ تماشہ نظر آیا

دو شخص سرِ معرکہ واں دفعتہً آئے ۔ اور شاہ کے پہلو میں بدرد و محن آئے
سر اپنے جھکائے ہوئے غمناک تھے دونو ۔ اور درد سے بادیدۂ غمناک تھے دونو
دونوں کی وزارت تھی بدربارِ مروّت ۔ اور چلنا انہیں دونو سے تھا کارِ مروّت

اک اُن میں کہ تھا برف نے ڈھالا بدن اس کا ۔ تھا اس کا بڑھاپا لمدی پیرہن اس کا
وہ خلقِ خدا میں تھا جو غمخوار سبھی کا ۔ اور آنکھ سے دکھ دیکھ نہ سکتا تھا کسی کا
جس پر کوئی صدمہ ہو وہ غم کھاتا تھا گویا ۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں گھلا جاتا تھا گویا
وہ رحم تھا اور رحم سدا کام تھا اُس کا ۔ تختۂ وزارت پہ رقم نام تھا اُس کا

اک دوسرا شخص اور جو ہمراہ تھا اس کے ۔ چہرے پہ برستا حشم و جاہ تھا اس کے
وہ نسخۂ حیرت بہ نگاہِ عقلا تھا ۔ اور تن پہ جو کی غور تو کندن سے ڈھلا تھا
کچھ توڑے زرِ نقد کے تھے ہاتھ میں اُس کے ۔ صندوق خزانوں کے تھے کچھ ساتھ میں اُس کے
پر ہاتھ میں توڑے جو گرانبار درم تھے ۔ خالی تھے بہت اُن میں بھرے رہ گئے کم تھے
عالم میں سخاوت سے کرم اُس کا لقب تھا ۔ تو بارِ وزارت کا اُٹھائے ہوئے سب تھا
دنیا سے کنارہ جو کیا شاہ نے حق کے ۔ سمجھا [illegible] اُس کے
میرے [illegible] خیر [illegible] قدر نہیں ہے ۔ [illegible] چرخِ بریں ہے
[illegible] ۔ [illegible] گئے کیا ہے

ل سینہ گندم سے بھی ہے تنگ تر اُن کا — دینے کو جو دیکھیں تو ہے پھٹنا جگر اُن کا
ب یاں سے چلا شاہِ خوش اقبال ہے اپنا — جو شاہ کا حال اپنے وہی حال ہے اپنا
و دونوں وہ غرض باندھ کے دست آ دب آئے — اور اُن کے دلوں سے یہ سخن زیرِ لب آئے
بے شبہ وفا کا تو یہاں نام نہیں ہے — یہ ملکِ فنا قابلِ آرام نہیں ہے
افسون و فسانہ پہ یہ دلدادہ ہیں سارے — اور دل میں بغاوت پہ یہ آمادہ ہیں سارے
حضرت نے جو تجویز کیا عین بجا ہے — اب یہ رہیں گمراہ یہی اُن کی سزا ہے
پر شاہ سے یہ عرض نمکخوار ہیں کرتے — اور مصلحتِ وقت کو اظہار ہیں کرتے
گو اہلِ جہاں پھیرے ہیں رُخ راہِ وفا سے — اور باندھے ہیں پیمانِ جفا مکر و دغا سے
پر ایسے بھی موجود ہیں اشخاص جہاں میں — اور جوہرِ اخلاص سے ہیں خاص جہاں میں
سلطانِ مروّت کو ہیں جو شاہ سمجھتے — اور شاہ کو ہیں سایۂ اللہ سمجھتے
یہ وضع زمانے کی خوش آئی نہیں ان کو — ان قدموں سے منظور جدائی نہیں ان کو
باقی نہیں دنیا کی ہوس کوئی رہی ہے — اب اُن کو تمنا جو رہی ہے تو یہی ہے
ہم بھی کہ ہیں شاہ کے شرمندۂ احساں — اور بندۂ حق شہ ہے جو ہے بندۂ احساں
جو ہو کہ شرف پاتے ہیں اس فیض کرم سے — شکر اس کے ادا کچھ نہیں ہو سکتے ہیں ہم سے
تک بار مگر سامنے ہوں شاہ کے اپنے — اور جوش جو ہیں جان ہوا خواہ کے اپنے
... ہیں شہ کے اس آن نکالیں — اور سینوں میں ہیں جو کچھ ہیں وہ ارمان نکالیں

جب لب پہ یہ اُن کے سخن پُر اثر آئے — اس شاہ کی آنکھوں میں بھی تب اشک بھر آئے

گزرے دلِ غمگیں پہ خیالات ہزاروں — اور پیشِ نظر پھر گئے حالات ہزاروں

کچھ بعد تامل کے مگر اُن سے کہا یہ — اُن کی جو تمنا ہے تو پھر بات ہے کیا یہ

گو رہ گیا میرا دلِ مجبور ہے مجھ کو — پر سب کی خوشی جو ہے وہ منظور ہے مجھ کو

دی جبکہ اجازت شہِ فرخندہ لقب نے — شہرت کی منادی سے وہیں سُن لیا سب نے

پابندِ مروت جو کچھ اشخاص تھے اُن میں — اور جادہ نما جو سرِ اخلاص تھے اُن میں

ہر سمت سے وہ فرقہ بہ فرقہ ادھر آئے — اور شاہ کے شکریے کو با چشمِ تر آئے

اِک فرقہ کا احوال نظر طرفہ تر آیا — وہ سب سے مقدم تھا قدم مار کر آیا

دولت تھی زر و سیم لٹاتی ہوئی آگے — اور نور سے تھی نور اُڑاتی ہوئی آگے

شہرت کی دوامی سے کئے نام تھے روشن — آغاز کی نسبت بہت انجام تھے روشن

اُمیدیں خلائق کی جو تھیں اُنکی طرف تھیں — اور آنکھیں زمانے کی لگیں اُنکی طرف تھیں

تھے اہلِ جہاں گرد اُمنڈ آئے ہزاروں — اور دامنِ امید تھے پھیلائے ہزاروں

تھا ظلم کی ظلمت سے جو ظلمات زمانہ — اور دن سے ہوا آنکھوں میں تھا رات زمانہ

تھے نورِ بقا شمع جلائے ہوئے آگے — ہاتھوں نکلے دیتے سب کے تھے آتے ہوئے آگے

پر شکل سے ملبوس سے اور طرزِ سخن سے — تھے مختلف الوضع جو وہ اصل وطن سے

میں اُن میں کسی شخص کو تھا جان نہ سکتا — اور کون ہیں یہ لوگ تھا پہچان نہ سکتا

وہ فرقہ مگر جب مرے نزدیک تر آیا — اور اُن میں مجھے حاتمِ طائی نظر آیا

سمجھا کہ سخاوت کے یہ پروردہ ہیں سارے
اور چشمِ مروّت کے نظر کردہ ہیں سارے

بعد اُن کے جو اشخاص کہ آتے نظر آئے
وہ شان و شکوہ اور دکھاتے نظر آئے

تھے دولتِ اجلال جلو میں لئے آتے
اور سر پہ ہما انکے تھے سایہ کئے آتے

تھے چترِ شہی ہو رہے قربان سروں پر
اور تاج فدا کر رہے تھے جان سروں پر

پر دخل نہ واں تک تھا ذرا تاجِ زری کا
افسر تھا سرِ ورق دھرا ناموری کا

لہرا رہے ایک ایک کے سر پر جو علم تھے
اعزازِ دوامی کے نشاں اُن پہ رقم تھے

تھے اُن پہ جو تاروں کی طرح نام چمکتے
تاحشر رہیں گے سحر و شام چمکتے

تھے نور سے تمکین و وقار اُن پہ برستے
اور پھولوں سے تھے رنگِ بہار اُن پہ برستے

یکساں تھے بہ حیثیتِ اقبال وہ سارے
پر وضع میں تھے مختلف الحال وہ سارے

کچھ رازِ نہاں دل پہ ہوا جس کا عیاں تھا
کسریٰ لقب اُن میں شہِ نوشیروان تھا

میں سمجھا کہ ایسے جو بہ تمکین ہیں آتے
اقلیمِ عدالت کے سلاطین ہیں آتے

مثنوی موسوم بہ گنجِ قناعت

مصروف تھا میں سیر میں شب عالمِ جاں کی
اور زیرِ نظر راہ تھی اسرارِ نہاں کی

ہر چند تھا جوں نقشِ قدم خاک کے اوپر — پر خاک پہ تھا ہیں گئے افلاک کے اوپر
ہر دم مجھے گھر بیٹھے زمانے کا سفر تھا — اور پائے تصور سے ہر اک دل میں گزر تھا
کھولے ہوئے دروازہ ہر اک سینہ تھا آگے — جو سینہ تھا گویا کہ اک آئینہ تھا آگے
سینے میں کبھی جاں میں کبھی اور کبھی دل میں — اور دل سے پہنچتا تھا کبھی آنکھ کے تل میں
روشن صفتِ آئینہ حالات تھے اُن کے — اور جوہرِ آئینہ خیالات تھے اُن کے
ہر منعم و ہر مفلس و ہر شاہ کو دیکھا — ہر مے کش و صوفی و حق آگاہ کو دیکھا
ہر چند کہ رفتار بہ سیرِ سفری تھی — آنکھوں پہ مگر عقل کی عینک جو دھری تھی
ہر دل میں نظر آتے تھے ارمان ہزاروں — اور اُن میں خیالات پریشان ہزاروں

القصہ ہر اک خانہ و کاشانہ میں ہو کر — یعنی کہ ہر اک دل کے نہاں خانہ میں ہو کر
جب پائے نظر میں نے رکھا پیشتر اپنا — اِک ایسے دلِ پاک میں پایا گزر اپنا
ہر چند کہ تھا تنگ وہ اوضاعِ جہاں سے — وسعت میں تھا کم دیدۂ کوتہ نظراں سے
پر گوشہ میں بیٹھا تھا لیے کون و مکاں کو — اور آنکھوں میں طے کرتا تھا میدانِ جہاں کو
دیکھا کہ ہے آراستہ اک انجمن اُس جا — اور جلوۂ انوار میں پرتو فگن اس جا
ہر چند کہ دربار تو شاہانہ نہیں تھا — اس دور میں جمشید کا پیمانہ نہیں تھا
پر تھا عجب اِک نور کا جلوہ کہ نہ پوچھو — اور اُس کا دلوں پر جو اثر تھا کہ نہ پوچھو

وہ گھر کہ جو سرمایۂ آسودہ دلی تھا　　اور کعبۂ دل خلق میں گر تھا تو وہی تھا
واں ڈر کی جگہ دل میں ادب ہوتے تھے پیدا　　جو رعب کے ثمرے تھے وہ سب ہوتے تھے پیدا

اک مردِ مقدس جو وہاں صدر نشیں تھا　　اور کعبۂ عظمت کے مکاں کا وہ مکیں تھا
عالم میں زن و مرد سے لے پیر و جواں تک　　آئے کہ نہ آئے کوئی اس بزم سے واں تک
تھا صدق سے ہر شخص کے دل میں ادب اُس کا　　اور خلق میں تھا خواجہ قناعت لقب اُس کا

حاضر تھی جو خدمت میں جماعت ندما کی　　ہوتی نہ ریاضت کبھی پہلو سے جدا تھی
اخلاق سے تھے یارانِ قدیمی میں ہمیشہ　　اور صبر و توکّل تھے ندیمی میں ہمیشہ
ہر چند کہ اک گوشہ میں سجادہ گزیں تھا　　پر مسندِ عزّت کے لئے صدر نشیں تھا

تھا تاج زری سر پہ نہ سرمایۂ شوکت　　اور زیرِ قدم تخت تھا نہ پایۂ شوکت
پر کہتی تھی دولت کہ یہ ہمّت کا دھنی ہے　　صورت یہی کہتی تھی کہ معنوں کا غنی ہے
تھی اُس کے سراپا سے عیاں شانِ قناعت　　اور پاؤں لپیٹے تھے بدامانِ قناعت

تھا بسکہ زمانے سے سروکار نہ اُس کو　　دُنیا کی ہوس تھی کوئی زنہار نہ اُس کو
نیّت تھی نہ جاتی کبھی مضمونِ طلب تک　　اور تھی نہ ہوس دل میں جو آتی کبھی لب تک

[illegible]

[illegible]

جو ہوا [illegible] اجنبیت سے [illegible]   [illegible] اجنبیت سے [illegible]
[illegible] تھی [illegible]   [illegible] تھی [illegible]
جو دن کے لئے [illegible]   [illegible] خالی نظر ہی تھی

جو [illegible] کرامات [illegible] اس کے [illegible]   [illegible] تھی ہر چیز کو ناچیز نظر میں
یا دور سے قاصد کو بھی نزدیک سے [illegible]   اور سامنے اس طرح سے تھی [illegible]
[illegible] مقصود نظر میں   یکساں تھے [illegible] نظر میں

ہوا جو وہ رخ سامنے اس مردِ خدا کے   جو دفعتاً اک آ گیا جھونکا سا ہوا کا
قدرت کا تماشا وہ دکھاتا ہوا آیا   اک پرچۂ اخبار اڑاتا ہوا آیا
قاصد کی طرح آن کے قالب میں صبا کے   رکھا بہ ادب سامنے اس مردِ خدا کے

ہ نامہ دیا پیک صبا نے جو یہیں لا کر — دیکھا اُسے تب خواجہ قناعت نے اٹھا کر
طوفان طمع میں جو پڑی خلق خدا تھی — اور چلتی زمانے میں ہوس کی جو ہوا تھی
تھے اس میں بہ تفصیل وہ احوال سراسر — اور تھے رقم ایک ایک کے احوال سراسر
س رقم پہ جب خواجہ قناعت نے نظر کی — اور دیکھی یہ روداد بنی نوع بشر کی
آزردہ ہوا دردِ حسرت کے سبب سے — منہ پھیر لیا اس نے دستِ چپ کیا غضب سے
اس طرح سے گرجا کہ ہو جوں ابر گرجتا — یا شیر کے ہو درد سے بے صبر گرجتا
معلوم ہوا تھا جو کچھ اخبار میں انکو — بھیجا ملک القدس کے دربار میں اُسکو
پر لوگوں کی نیت تھی جو دیکھی ہوئی اُس نے — اس واسطے ایک آپ بھی عرضی لکھی اُس نے
تحریر کئے اس میں جو تھے حال یہاں کے — اور جن میں تھے آلودہ بد اعمال یہاں کے
لکھا کہ ہے عالم میں عمل بوالہوسی کا — ایمان خدا نے نہیں دنیا میں کسی کا
دیتے مری نیکی کا بدی میں صلہ مجھ کو — اور کہتے ہیں بے ہمتی ہے حوصلہ مجھ کو
ہے ان کو ہوس طوق بہ گردن کئے پھرتی — کتے کی طرح سب کو ہے در در لئے پھرتی
آنکھوں پہ لیا سر پہ جو آیا کوئی ٹکڑا — پر صبر و قناعت کا نہ پایا کوئی ٹکڑا
ہیں خواری و زاری کے لئے یار یہ حق اس سے — اے کاش قناعت کا بھی لیتے سبق اس سے

ایسے بھی ہیں اکثر کہ ہیں افلاس سے مرتے — دن رات پڑے ہیں الم و یاس سے مرتے
محنت سے جو برگشتہ ہے نیت ہوئی انکی — اور حد سے ہے گذری ہوئی بے ہمتی انکی

یعنی کہ بہ ترتیب ہر اک فرقہ جدا ہو — اور سامنے آئینہ کے حاضر بصفا ہو
دنیا میں کسوٹی ہے وہ ہر کھوٹے کھرے کی — اور دینا خبر ہے تہِ دل سے بھی پرے کی
جس شخص کی تصویر کہ اس میں اتر آئے — باطن کی جو حالت ہے وہ ظاہر نظر آئے

اِک فرقہ یکایک ہوا دربار میں حاضر — اور پہلے ہوا معرضِ اظہار میں حاضر
خوشحال بھی تھے اور زدہ احوال بھی انہیں — تھے حادثۂ دہر کے پامال بھی ان میں
پر چتر لگاتے تھا وقار اُن کے سروں پر — دولت کھڑی ہوتی تھی نثار انکے سروں پر
کچھ ایسے بھی جو تھے انہیں جی سیر تھے انکے — آسودہ شکمی نے کئے دل سیر تھے اُن کے
خالی تھی سبب سے نہ یہ آسودہ شکمی بھی — اک بات میں تھی انکو قناعت کی کمی بھی
یعنی کہ بظاہر تھے شکم وصلِ کمر میں — جس سے کہ سبک تھے کس و ناکس کی نظر میں
یوں تو کہ تھے ماہرِ فضل و کمالات کے سارے — محتاج اگر تھے تو اسی بات کے سارے

دیکھے ملک القدس نے جب حال سبھوں کے — آئینہ ہوئے جوہرِ اعمال سبھوں کے
اعزازِ دوامی کے دیئے تاج بھی اُن کو — اور ملکِ قناعت کے دیئے تاج بھی ان کو
تا اہلِ جہاں میں رہیں ممتاز ہمیشہ — اور ہوویں زمانے میں باعزاز ہمیشہ

بعد اس کے گروہ اور اک آتا نظر آیا — اور اُس میں تماشا یہ نظر طرفہ تر آیا

آئے بہ ہوس سب بیسے قدم مار کے آگے — پر پہنچے جب آئینۂ اسرار کے آگے
سر تا بقدم عکس ہوئے جلوہ گر اس میں — اس طرح کہ آئے وہ نظر جانور اس میں
جن کے بدنوں پر نہ دہن تھے نہ گلے تھے — کھانے کے لئے سارے شکم ہو کے ڈھلے تھے
ملتی تھی نہ وہ شے کہ قناعت کریں جس پر — مانند مگس تھے کبھی اس پر کبھی اس پر
تھے خوار ہی و رسوائی میں دن کاٹتے پھرتے — اور ہونٹ تھے مکھی کی طرح چاٹتے پھرتے
پر ولولۂ حرص ہوئے تھے کم ان کے — غربال کی صورت تھے نہ بھرتے شکم انکے

کچھ لوگ عجب رنگ دکھاتے ہوئے آئے — اور اپنے تماشے پہ ہنساتے ہوئے آئے
راحت طلبی ان کو گرانبار تھی کرتی — اور زندگی اس طرح سے مردار تھی کرتی
ہل کر انہیں جانا تھا کہیں گور کا جانا — یا قید مشقت کی طرف چور کا جانا
آنے میں بھی تھے جان چراتے ہوئے آتے — لوگ انکو تھے کاندھوں پہ اٹھائے ہوئے آتے
القصہ وہ جب بیچ میں دربار کے آئے — اور سامنے آئینۂ اسرار کے آئے
تھے سانڈ کہ سر ڈالے کے ناچار کھڑے تھے — اور کرتے جگالی سر دربار کھڑے تھے

اور ٹٹی کے اوجھل میں جو عیار تھے بیٹھے — دن رات شکاروں کے طلبگار تھے بیٹھے
پردے میں قناعت کے وہ تھے تیر لگاتے — اور دام دغا تھے پئے نخچیر لگاتے
ظاہر میں بڑی تمکنت و شان سے آئے — لیکن نظر آئینے میں شیطان سے آئے

روباہ کی صورت نظر آتے تھے وہ سارے / گرگٹ کے مگر رنگ دکھاتے تھے وہ سارے
جس خانۂ دل میں یہ طلسمات عیاں تھے / آئینۂ حالات خیالات جہاں تھے
اس طرح کا گھر خلق میں سوچو تو کہاں ہو / حیراں ہوں کہ وہ خانۂ دل ہو تو کہاں ہو

بند آنکھیں کئے بیٹھے رہے ایک کے گھر تو / اپنے ہی جیب و داماں ذرا غور تو کر تو
پہلو میں کہیں تیرے نہ وہ خانۂ دل ہو / آزاد وہ اپنا ہی نہ کاشانۂ دل ہو

مثنوی مسمّٰی بہ ابرِ کرم

جو نکتہ یاب ہیں کتبِ انقلاب کے / دن رات کو سمجھتے ورق ہیں کتاب کے
دفتر ہے اُن کے سامنے ماضی و حال کے / ہر آگے آئینہ ہے دکھاتا مثال کے
شاہانِ باسلف کے مرقعے عجیب ہیں / روشن سب اس میں عہدِ بعید و قریب ہیں
تحریرِ تازہ لاتی ہے تقدیر سامنے / آتی ہے دمبدم نئی تصویر سامنے
اس کشورِ فنا کا عجب طرز و طور ہے / دم بھر میں صورت اور ہے دم بھر میں اور ہے
قانونِ انقلاب یہاں رسم و راہ ہے / موسم بہ موسم اس میں نیا بادشاہ ہے
اب یاں جو چند روز سے قانونِ عام ہے / گرمی کے بادشاہ کا گرم انتظام ہے

والہ تھا شعلہ خیز و فلک شعلہ ریز تھا　　اِک حکم تھا جو گرم تو اک حکم تیز تھا
بے پڑ زمیں کے دیکھو تو بس خاک اُڑ رہی　　اور گرد چار سو تہِ افلاک اُڑ رہی
دُنیا میں بوند بوند کو خلقت ترس رہی　　پانی کی جا سے آگ فلک سے برس رہی
شہروں میں سوکھ سوکھ کے جنگل چمن ہوئے　　اور جنگلوں میں دھوپ کے کالے ہرن ہوئے
طفلِ نبات پیاس کے مارے بلک گئے　　خلقِ خدا کے نالے بہت دور تک گئے
سیلاب ہو کے پسینے سے ہر دل نکل چلا　　اور آفتاب شمع کی صورت پگھل چلا
دل تشنگی کے مارے بے بیتاب ہو گئے　　انساں تڑپ کے ماہیِ بے آب ہو گئے
پر اب ہے دور دورۂ برشگال کا　　چھایا فلک پہ ابر ہے [illegible] بادل کا
گرمی کا جو بخار تھا سارا نکل گیا　　اور رنگ آسمان و زمیں کا بدل گیا
فرمانِ راحتِ سحر و شام آ گیا　　خلقِ خدا کی جان کو آرام آ گیا

اے ابر آ کہ تو تو شہِ برشگال ہے　　جو خشک و تر ہے [illegible] نہال ہے
تیرے عمل کے واسطے رنگِ جہاں ہے اور　　تیری زمیں ہے اور تیرا [illegible] ہے اور
نوروزِ آب و رنگِ بہارِ جہاں ہے　　تو تو بہارِ کشورِ ہند [illegible]ن ہے

اے ابر جوشِ سبزہ و گلشن نہیں ہے یہ　　پھولوں نہیں سماتی خوشی سے زمیں ہے یہ
مدت سے انتظار تھا تیرا جہان کو　　آنکھیں سبھوں کی لگ گئی تھیں آسمان کو

آنے سے تیرے آگیا آنکھوں میں نور ہے ۔۔۔ دیوار و در سے آج برستا سرور ہے
تیرے ہی دم قدم کی یہ سب لہر بہر ہے ۔۔۔ سیراب کوہ و دشت تو شاداب شہر ہے

ہر قطرہ تیرا قطرہ ہے آب حیات کا ۔۔۔ پاتا حیات تجھ سے ہے عالم نبات کا
وہ وجود ہے نبات کے اطفال کے لئے ۔۔۔ اور زندگی درخت کہن سال کے لئے
اے ابر زور کیا کہوں میں تیرے شیر کے ۔۔۔ دانہ پہاڑ کو ہے نکل آتا چیر کے
سب تجھ سے نونہال چمن سبز بخت ہیں ۔۔۔ اور میووں سے بھرے ہوئے دامن درخت ہیں
یہ پھول پھل نہیں ہیں برابر نکل پڑے ۔۔۔ جو جو چھپے پہاڑ کے باہر نکل پڑے
گہ پیرہن سبز اڑھاتا زمیں کو ہے ۔۔۔ پھولوں کو گاہ کرتا شگفتہ جبیں کو ہے
گردوں پر کرتا عالم نیرنگ ہے کبھی ۔۔۔ دکھلاتا ایک رنگ میں سو رنگ ہے کبھی
سیماب بیچ ہیں کبھی شنگرف کا گھولنا ۔۔۔ اور وہ نگار خانۂ چینی کا کھولنا
لاتا کبھی کچھ اور ہی جوش و خروش ہے ۔۔۔ کرتا فلک کو بادلوں سے زرنگار پوش ہے
یوں رنگ دم بدم جو بدلتا جہاں کے ہے ۔۔۔ اے ابر یہ کبھی شعبدہ بازی کہاں سے ہے

اے ابر جب تو آتا ہے میداں پہ موج کے ۔۔۔ دل بادل آگئے پیچھے لئے ساتھ فوج کے
آتا ہے دیوزاد کی صورت بنا کے تو ۔۔۔ اور بال و پر نمد کے ہے اڑتا لگا کے تو
اس وقت تیرے رعد کی آواز ہے غضب ۔۔۔ اے ابر تیرے ساتھ یہ دمساز ہے غضب

بل بے تری گرج سے دل زار ہل گئے — ہیبت سے تیری رعد و برق کی کہسار ہل گئے
لیکن جو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ہیں آرہی — اور جھینگروں کے سازوں پہ سُر ہیں ملا رہیں
کوئل کی کوک اور پپیہے کا بولنا — اور بیچ بیچ بولیوں میں وہ شربت کا گھولنا
اے ابر سب یہ ساز نوا تیرے دم سے ہیں — یہ لطف عیش و لطف ہوا تیرے دم سے ہیں

غنچوں کے مارے پیاس کے تھے منہ کھلے ہوئے — گلشن کے نونہالوں کے منہ کے ڈھلے ہوئے
انسان پھرتے پیاس سے تھے بدحواس سے — منہ کھولے تھے کبوتر و گنجشک پیاس سے
رونق سبھوں کے منہ پہ ہے اس آن آگئی — آنے سے تیرے جان میں ہے جان آگئی

تیرا خطاب رحمت پروردگار ہے — مخلوق خدا کے رزق کا تو ذمہ دار ہے
سرمایہ تو ہی دیتا ہے تجار کے لئے — اور سایہ ہما ہے زمیندار کے لئے
اے ابر وہ جو خلق میں دہقان پیر ہے — عمریں ہوئیں لکیر پہ بیٹھے فقیر ہیں
اُن کو امید تھی نہ کسی کی پناہ تھی — تجھ پر نظر تھی یا کہ خدا پر نگاہ تھی
آج اپنے رنج و غم سے انکو فراغ ہیں — ہیں بیٹھے اپنے کھیتوں پہ اور باغ باغ ہیں

اے ابر تیرے فیض کا ہر جا وفور ہے — یہ کوہ و کہسار میں کچھ اور طور ہے
ہیں سب پہاڑ پھولوں سے دامن بھرے ہوئے — اور گلبنوں سے لے کے شجر تک ہرے بھرے

چشمے ہیں جا بجا [illegible] ہے — ہوا زباں [illegible] ہے

بیری چمک رہی ہے نشہ ہو رہا ہے پیدا — [illegible] پیدا ہوا
سب [illegible] ہے [illegible] کی — [illegible] کی
[illegible] آب [illegible] — [illegible]
بے ہوش [illegible] ہے [illegible] — [illegible]

پپیہوں کو شوق ہے سبھی مست [illegible] — [illegible] پیام پہ
مستانہ چمن میں [illegible] ہے [illegible] بھی — [illegible] بھی
سبزے پہ لوٹتا ہے دماغ آسماں پہ ہے — اور سب ہم [illegible] زباں پہ ہے
یوں پھوٹ پھوٹ [illegible] ہیں گل [illegible] نکل پڑے — کیا جانے کون کون کے ہیں ارمان نکل پڑے

اس وقت تو تو چھایا ہوا ہے جہان پر — چھایا ہوا سماں ہے زمیں آسمان پر
چلنا وہ بادلوں کا زمیں جھوم جھوم کر — اور اٹھنا آسماں کی طرف جھوم جھوم کر
بجلی کو دیکھو آتی ہے کیا کوندتی ہوئی — سبزے کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا روندتی ہوئی
آتی ادھر صبا ہے ادھر سے نسیم بھی — اور ان کے ساتھ ساتھ ہے آتی شمیم بھی
مستی میں جھومنا وہ جوانانِ باغ کا — جھک جھک کے لینا منہ سے گل کے ایاغ کا

سبزے کے عکس سے در و دیوار سبز سبز — سیراب باغ و دشت تو کہسار سبز سبز
ان سبز سبز کیاریوں پہ دل ہیں لوٹتے — طوطی برنگ طائر بسمل ہیں لوٹتے
شبنم عجب بہار ہے اپنی دکھا رہی — موتی بکھیرتی ہے جواہر لٹا رہی
سبزے کے برگ برگ میں موتی جڑے ہوئے — شاخ و شجر تمام مرصع کھڑے ہوئے
پتوں پہ آب رنگ سے مینا نگار ہیں — ٹپکے اگر ہوا سے تو ہیرے کا ہار ہیں
شبنم کا جوش گر یہی طوفاں اٹھائیگا — ہیرا چمن کی اوس پہ الماس کھائیگا
لو بادل اب گرجتے ہوئے سر پہ آگئے — اور شامیانے شرق سے تا غرب چھا گئے
کیا مست آیا جھوم کے سرشار ابر ہے — برسے گا آج خوب دھواں دھار ابر ہے
آیا امنڈ گھمنڈ کے عجب دھندوکار ہے — دن کی گر لگا دے جھڑی تو بہار
لیکن یہ باجرا سا برسنا پھوار کا — ہے گا پیام ابر بہاری کے تار کا

بوندوں میں جھومتی وہ درختوں کی ڈالیاں — اور سبز کیاریوں میں وہ پھولوں کی لالیاں
بوٹنیوں میں پانی کے قطرے ڈھلک رہے — وہ کیاریاں بھری ہوئیں تھالے چھلک رہے
آب رواں کا نالیوں میں لہر مارنا — اور روئے سبزہ زار کا دھو کے سنوارنا
گرنا وہ آبشار کی چادر کا زور سے — اور گونجنا وہ باغ کا پانی کے شور سے
جل تھل ہیں کوہ دشت میں تالاب آگئے — گویا چھلک رہے ہیں کٹورے گلاب کے
ہر جا پہ طائران چمن غول غول ہیں — آپس میں بول بول کے کرتے کلول ہیں

کوئل کا دور دور درختوں پہ بولنا
اور دل میں اہلِ درد کے نشتر گھما گولنا
طاؤس کا وہ دُم کو چنور کر کے ناچنا
اور مورنی کا اشک کے موتی کو جانچنا
لیکن چمن سے ناچ کے چلتا جو مور ہے
اِک قہقہہ پہ طنز لگاتا چکور ہے
املی کے اک درخت پہ جھولا پڑا ہوا
اور ساتھ اُس کے آم کا ٹھیکا لگا ہوا
جھولوں میں نوجوان ہیں پینگیں چڑھا رہے
اور نیچے آم کے ہیں پپیہے بجا رہے
ساون کے گیت اُٹھا رہے طوفاں دلوں میں ہیں
پردیسیوں کی یاد سے ارماں دلوں میں ہیں
ہر تان میں ملہار کی مستی کا شور ہے
بادل گرج کے پڑتے ہیں دنیا گھور ہے

اے ابر تیری رات کی تعریف اگر کروں
لازم ہے پہلے میں رہِ ظلمات سر کروں
کیا کیا بیاں کروں میں تیری رات کا مزہ
گر رات کا مزا ہے تو برسات کا مزہ
سنسان رات اور وہ آئی ہوئی گھٹا
چاروں طرف جہان میں چھائی ہوئی گھٹا
بجلی کبھی کبھی نگہِ فتنہ ساز سے
کرتی نقابِ ابر میں چشمک ہے ناز سے
اور کوکنا پپیہے کا وہ دل کی ہوک سے
نالہ کو اپنے تولنا کوئل کی کوک سے
کوٹھے پہ ٹھنڈے ٹھنڈے بچھونے وہ اوس میں
ہے فخرِ گل کو آئے اگر پائے بوس میں
آنا وہ بھیگی بھیگی ہوا کا کبھی کبھی
بول اُٹھنا مرغِ نغمہ سرا کا کبھی کبھی
آرام کہہ رہا ہے کہ میرے ہی ہو رہو
قسمیں ہے دیتی نیند کہ بس اب تو سو رہو
آزاد لکھتے لکھتے ہی آدھی تو ڈھل گئی
اور شمع لالٹین میں ساری پگھل گئی

طولِ امل کو اپنے اب انجام دیجیے
کوئی گھڑی تو آپ بھی آرام کیجیے

مثنوی زمستان

اے زمستان کہ ہے تو بادشہِ برفانی
شاہِ برفانی و شاہنشہِ برفستانی

تختِ اقبال ہے عالم سے نرالا تیرا
اور ہے دربار سرِ کوہِ ہمالہ تیرا

شرق تا غرب ترا اک سا ہے ہر طرف سفید
اڑ رہا پرچمِ اقبال ہے جوں برف سفید

جبکہ عالم پہ ہے تو لشکرِ جنگی لاتا
کوہ و صحرا کو برابر ہے الٹتا آتا

بادِ صرصر ہے نشاں تیرا اڑاتی آتی
فوجِ اقبال کو رستہ ہے بتاتی آتی

طرفۃ العین میں کر لیتا ہے تسخیرِ جہاں
تیرے آتے ہی بدل جاتی ہے تاثیرِ جہاں

جس طرف تیرے پھریرے کا ہے جھونکا جاتا
مارے ہیبت کے ہے دل سینوں میں تھرا جاتا

ہے نباتات کا عالم تہ و بالا تجھ سے
پرزے پرزے ہے گلستاں کا رسالہ تجھ سے

باغ پر جب ہے ترے قہر کا جھونکا آتا
ڈر کے ہر برگ ہے پیوندِ زمیں ہو جاتا

تیرے سناٹے سے جاتی ہے ہوا جانِ نبات
خوف کے مارے دہل جاتے ہیں طفلانِ نبات

تھرتھراتے ہیں ٹھٹھرتے سارے جوانانِ چمن
منہ چھپاتے ہیں گل و سنبل و ریحانِ چمن

ہیں شجر سر پہ کھڑے خاک اڑاتے سارے — گل و گلزار ہیں ویراں نظر آتے سارے
نغمہ سنجانِ چمن پر ہیں پھلائے بیٹھے — اور پر و بال میں ہیں منہ کو چھپائے بیٹھے
باغباں کا جو گلستاں میں گذر ہوتا ہے — لب حیرت سے یہی کہتا ہے اور روتا ہے
یاالٰہی وہ جوانانِ چمن ہو گئے کیا — باغ سنسان ہے مرغانِ چمن ہو گئے کیا
رازِ غم کس سے کھلے باغ میں بلبل بھی نہیں — کان میں پوچھے کس سے کہ رہا گل بھی نہیں
نہ تو غنچہ کوئی باقی ہے کہ جو منہ کھولے — نہ ہے گلزار میں سوسن جو زباں سے بولے
کہ درختانِ چمن باغ میں عریاں کیوں ہیں — ہاتھ پھیلائے کھڑے ششدر و حیراں کیوں ہیں
اے زمستاں تیری خدمت سے ہے بوالعجبی — فی الحقیقت ہو تیری خدمت میں تری بے ادبی
تجھ سے ہے دور ہواؤں کی کثافت ہوتی — دفع زہرِ حشراتی کی ہے آفت ہوتی
خلق سے دفع وباؤں کی بلا ہوتی ہے — اور مریضوں کو ترے دم سے شفا ہوتی ہے
خشک ہوتی ہے مزاجوں کی رطوبت تجھ سے — پاتا ہر میوہ شیریں ہے عذوبت تجھ سے
تو نے ہے صاف کیا بار تا قاف سے تا قاف کیا — شیشۂ گنبدِ فیروزہ ہے شفاف کیا
مخمل و قاقم و سنجاب پہناتا تو ہے — جنت اثمارِ تر و خشک کھلاتا تو ہے
تو نہ تھا جب تو نہ تھا جان کو جینے کا مزا — تھا نہ کھانے ہی کا کچھ اور نہ پینے کا مزا
اب عمل میں ترے آرام سے سب جیتے ہیں — گرم کھاتے ہیں غذا آب خنک پیتے ہیں

یا تو گرمی سے نہ تھا پاس بھی بیٹھا جاتا — اور لعش سے دل وحشت زدہ نکلا جاتا

یا ہیں اب ہاتھوں کو بغلوں میں دبائے لیتے — آگ ہاتھ آئے تو دل میں ہیں چھپائے لیتے
پالے سے سردی کے ہو گئے سینوں میں ٹھٹھراتے ہیں — بچے ماں باپ کی بغلوں میں گھسے جاتے ہیں
ہے کوئی چھینٹ کا اوڑھے ہوئے دغل بیٹھا — پر پُھلائے ہوئے جیسے کوئی بلبل بیٹھا
اوڑھے بیٹھا کوئی سردی سے لحاف اپنا ہے — کوئی گر بیٹھا بچھونے کو غلاف اپنا ہے
کچھ لحافوں سے ابھی منہ کو نکالے ہیں پڑے — لیکن انگیٹھی کو پہلو میں سنبھالے ہیں پڑے
کبھی سکڑے ہوئے بیٹھے ہیں کبھی کانپتے ہیں — ہیں کبھی کانپتے سردی سے کبھی ہانپتے ہیں
کہیں سُو سُو کہیں سی سی ہے کہیں سیٹی ہے — گرد سب بیٹھے ہیں اور بیچ میں انگیٹھی ہے
حال دیکھے ہیں جو یہ خلق کی بدحالی کے — رونگٹے ہو گئے سردی سے کھڑے قالی کے
ں کی ہر بیل میں چھپ چھپ کے ہیں سنبل بیٹھے — پردہ رنگ میں ہیں دبکے ہوئے گل بیٹھے
خلق نے گرمی و سردی کی جو ہے لاگ لگی — تن تو ٹھٹھرے ہیں پڑے سینوں میں ہے آگ لگی
نفس بھاپ کے پردے میں نکلتے ہیں دھوئیں — دل میں آگ لگی منہ سے اگلتے ہیں دھوئیں

رے افضالِ سخاوت نہ افلاک ہیں عام — یعنی سب اہلِ جہاں کے لئے پوشاک ہے عام
لِ دولت کو ہیں خلعت میں دوشالے ہوتے — غربا سارے ہیں کمل کے حوالے ہوتے
دیا تو نے ہے خلقت کو ہر اک حال میں مست — ہے کوئی کھال میں مست اور کوئی شال میں مست
ن عالم ہیں الگ بسترِ مخمل میں پڑے — فقرا لپٹے ہیں سب ایک ہی کمل میں پڑے

ے زمستاں کہوں کس طرح تیری رات کا لطف — تیری شب ہائے دراز اور وہ مہربات کا لطف

کی تری رات نے داناؤں کی ہے بات بڑی — کہ کبھی دن ہیں بڑے اور کبھی رات بڑی
ہے جواں لینا اسی شب میں جوانی کا مزا — اور جو بچہ ہے تو لینا ہے کہانی کا مزا
بزم احباب کی صحبت کا مزا ہے تجھ سے — ساز عشرت کے لئے برگ نوا ہے تجھ سے
شب سرما ہی میں ہے گانے بجانے کا مزا — پان کھانے کا گلوری کے چبانے کا مزا
یار حقے کے ترے دور میں لیتے ہیں مزے — دودِ تلخ اسکے سوا دود سے دیتے ہیں مزے
گھونٹ حقے کا یہ ہر دم نہیں ہم بھرتے ہیں — اے زمستاں یہ تجھے عشق کے دم بھرتے ہیں
صوفی و رند کے جلسے کا تو ہی ساقی ہے — مایۂ عیش و طرب دم سے ترے باقی ہے
ہر طرف ہے گی پیالی پہ پیالی اُڑتی — مے نہ ہو تو بھی ہے تصویر خیالی اُڑتی
سب نشے مست پڑے شکر خدا کرتے ہیں — چاہئیں پی پی کے ترے سر کو دعا کرتے ہیں

شب سرما میں اگر لطف ہے مے نوشی کا — تو اسی شب ہے مزا مجلس خاموشی کا
ہیں کبھی عالم ارواح کے مہماں آتے — بزم دربار میں ہیں صاحب فرماں آتے
دل کے ایواں میں ہیں وہ آکے عدالت کرتے — ہیں کتابوں کے وکیل ان کی وکالت کرتے

جلوہ گر پیش نظر ہوتی ہے فانوس خیال — پھرتے ہیں چار طرف ڈھونڈتے جاسوس خیال
بیٹھا جمشید کہیں دیکھتا ہے جام اپنا — پر سمجھ میں نہیں آتا ہے کچھ انجام اپنا
دوش ضحاک پہ آتے ہیں کبھی مار نظر — سر ضحاک ہے آتا بہ سر دار نظر

لبرز کو دوش پہ رستم ہے اُٹھائے جاتا
ہفتخواں میں ہے کبھی رخش اُڑائے جاتا

کبھی سہراب سرِ خاک نظر آتا ہے
باپ بھی غم سے جگر چاک نظر آتا ہے

کہیں دربارِ سکندر کہیں بزمِ دارا
اور کہیں عزمِ سکندر ہے بہ رزمِ دارا

تن دارا ہے کہیں بے سر و افسر ہوتا
اور سرہانے ہے کھڑا اُسکے سکندر روتا

خضر کے ساتھ سکندر کہیں ظلمات میں ہے
کبھی نوشابہ سے مصروف ملاقات میں ہے

قندو پاژند کو زرتشت سُناتا ہے کبھی
شُعلہ در آب میں آتش کو دکھاتا ہے کبھی

کبھی محمود ہے چڑھ کر سرِ جے پال آتا
کشورِ ہند میں ہے گویا کہ بھونچال آتا

قصّہ نعمان خورنق کا جماتا ہے کبھی
ستّار اپنے کٹے ہاتھ دکھاتا ہے کبھی

گاہ چنگیز ہے اور گاہ ہلاکو آتا
جیسے گھر لوٹنے کو ہے کوئی ڈاکو آتا

جب بہت طول پکڑتی ہے شبِ یجوری
لے کے تیمور ہے آتا تزکِ تیموری

ہند سے گرچہ بہت جلد چلا جاتا ہے
پشت در پشت مگر سکّہ جما جاتا ہے

بزمِ افسانہ میں آن خسروِ پرویز بھی ہے
باربُد زمزمہ سے اپنے شکر ریز بھی

قصرِ شیریں سے ہے فرہاد بھی دلگیر آتا
پر بغل میں لئے شیریں کی ہے تصویر آتا

خون فرہاد سے تیشہ ہے کھلاتا لالہ
چادر اوڑھے ہے کھڑی بیرزنِ دلالہ

ہیں یہاں انجمنِ علم کے جو صاحب راز
فصلِ سرما میں ہیں جب شب کہ بنتے شبہائے دراز

خانۂ دل میں وہ اِک بزم ہیں قائم کرتے
منعقد مجلسِ اربابِ عمائم کرتے

فخر رازی کبھی لے آتے ہیں تفسیر کبیر — بوعلی آ کے سناتے ہیں شفا کی تقریر
ہوتی ہیئت کی مجسطی سے ہے توضیح وہاں — کبھی ہوتی ہے سطرلاب کی تسطیح وہاں
ہے کوئی جلد دلائل کو تجزیے سے کرتا — کوئی ابطال جز لا یتجزیٰ سے کرتا
ہے دلائل سے خدا کو کوئی باطل کرتا — پر ہے دانائے فرنگ اسکو بھی قائل کرتا
دفعتہً چلتی ہے مجلس پہ ہوائے یونان — یعنی تشریف ہیں لاتے حکمائے یونان
ہے فلاطون لئے اشراق کے آئینہ کو — کرتا آئینہ سے ہے صاف سوا سینہ کو
پیر ارسطو جو کبھی بزم میں آ جاتا ہے — باتوں ہی باتوں میں ہر شکل مٹا جاتا ہے

رکھتے ہیں جو کہ طبیعت میں ہوائے چمنی — چلتی ہے اُن کی طبیعت پہ ہوائے چمنی
آ کے سودا کبھی اک ہجو سُنا دیتے ہیں — لیکن اس طرح کہ محفل کو لُٹا دیتے ہیں
پھر کبھی بڑھ کے سُناتے ہیں قصیدہ اپنا — میر پڑھتے ہیں کوئی شعر گزیدہ اپنا
ناسخ و آتش و انشا و نصیر آتے ہیں — غالب و ذوق مگر خاتمہ کر جاتے ہیں

ہوتی ہے اتنے میں افلاک پہ تنویر سحر — ٹیکتا آتا ہے مشرق سے عصا پیر سحر
سر پہ اپنے وہ بکھیرے ہوئے ہے موئے سفید — ریش پُر نور میں ہے جلوہ نما روئے سفید
شجر طور کا عالم ہے بناتا آتا — ساتھ ہے کوہ ہمالہ کو اُٹھاتا لاتا
ہند کو کابل و کشمیر بنا دیتا ہے — ملک تاتار کی تصویر بنا دیتا ہے

گرچہ ہر جا پہ ترے چلتے قوانین ہیں اور — اے زمستاں ترے اس ملک ہیں آئین ہیں اور
ایک جھٹکا جو ترے حکم کا آجاتا ہے — تو نباتات کا سب رنگ بدل جاتا ہے
زرد ہو جاتے ہیں سب دشت سے کہسار تلک — کوہ سے کاہ تلک باغ سے اشجار تلک
وال اسی فصل میں گویا نظر آتی ہے بسنت — زعفراں پوش درختوں کو بناتی ہے بسنت
عقل حیراں ہے کہ سونا یہ بکھیرا کس نے — آب زر روے نباتات پہ پھیرا کس نے
بعض اشجار پہ ہے حکم بہت سخت آتا — پتے پتے کو جلاتا ہوا یک لخت آتا
ل میں ہر برگ کے یوں آگ لگا دیتا ہے — جس طرح سے کوئی تانبے کو تپا دیتا ہے
ر شجر پر ہے غرض رنگ بدل کر آتا — کہیں زرکار ہے آتا کہیں مسگر آتا

تیرے حکم کے جھونکے ہیں سوا تیز ہی ہے — کہ نباتات پہ طوفانِ بلا برپا ہے
ک دیکھو تو ہیں سب جھڑ کے سر خاک پڑے — اور شجر سب ہیں برہنہ تہ افلاک پڑے
فتہ پیرِ سحر سانس ہے بھرتا ایسا — یا زمانے پہ وہ کچھ سحر ہے کرتا ایسا
جہاں آنکھ نہیں ہو جاتا ہے یکبار سفید — دشت و کہسار سے لے تا در و دیوار سفید
ن طرح بخارات کا گھر کر آنا — برف کے پرتے ہیں وہ روئی دھنکتے جانا
ے بلکے کبھی ٹکڑی کے ہیں جا لے اڑتے — اور ہوائیں ہیں کبھی روئی کے گالے اڑتے
بجا آب رواں چلنے سے ہیں تھم جاتے — اور سر چشمہ میں شیشے کی طرح جم جاتے
جر گلشن ہستی ہیں برہنہ بجتے کھڑے ہیں — یا کہ پتوں کو بڑھاتے ہوئے گہنا تھے کترے

شجر نور سر نیزہ نظر آتے ہیں　　سر بسر غیرتِ بتّور نظر آتے ہیں

ہیں زمستان تیرے سب کام زمانے سے الگ　　یہ لطیفہ ہے کہ نم میں آنے سے الگ
جام گرمنڈواں ہیں ہے تو شیر بنانا کیونکر　　اور ہوا میں ہے تنہا شیر اڑانا کیونکر
ابر باراں تو تہ چرخ [illegible] دیکھا تھا　　پر برستا ہوا کافور نہیں دیکھا تھا

تب کبھی ہوتا ہے گزر جانبِ کہسار ترا　　زینِ صنعت ہے وہیں اور کچھ اے یار ترا
بت تراشی میں ہے تو غیرتِ فرہاد وہاں　　قصرِ شیریں کی ہے تو ڈالتا بنیاد وہاں
اک طلسمات کا عالم ہے دکھاتا جاتا　　صورتیں برف سے کیا کیا ہے بناتا جاتا
پتّے پتّے کا ہے تصویر میں انداز درست　　اور ہر اک میوے پہ قدرت ہے خداساز درست
اژدہا دامنِ کہسار میں سوتا ہے وہیں　　برف کا اسپ سبک تیز بھی ہوتا ہے وہیں
ہے کہیں دیو کی تصویر نمودار کھڑی　　اور پری ہے پر پرواز سے تیار کھڑی
چیتا کہتا ہے کہ میں جست ابھی کرتا ہوں　　اور ہرن کہتا ہے میں چوکڑی بھر جاتا ہوں
برف کا بیل کہیں سر ہے جھکاتے بیٹھا　　اور کہیں اونٹ ہے گردن کو اٹھائے بیٹھا
شیر وابستہ زنجیر بناتا ہے وہیں　　اور کبھی صورتِ شیطان بنا جاتا ہے
[illegible] کبھی حیوان بنا دیتا ہے　　اور کبھی صورتِ شیطان بنا جاتا ہے

اے زمستاں جو کبھی آذر و فرہاد ہے تُو — تو کبھی رشکِ دہِ مانی و بہزاد ہے تُو
برف سے عجب ہے نکھرنا فلکِ زنگاری — اور تری طبع ہے آتی سوئے رنگیں کاری
کسی صیاد کو ہے کر کے ضیافت لانا — اور کوئی صید ہے سرگشتۂ آفت لانا
لیتا پھر کارِ قلم ہے دمِ شمشیر سے تُو — اور ہے شنگرف بھی لیتا رگِ نخچیر سے تُو
کی سرِ خاک پہ نقشی برف نے سیمیں کاری — خونِ بے جرم سے کرتا ہے اُسے گلنار تُو
صید تو صید کا خوں رنگ جو دکھلاتا ہے — تیر سا دیدۂ عبرت میں چُبھا جاتا ہے

ہے گزر جبکہ ترا جانبِ دریا ہوتا — اک طلسمات کا گویا ہے تماشا ہوتا
ایسا تو حکمت و جادو سے جماتا ہے اُسے — سربسر تختۂ الماس بناتا ہے اُسے
کاروانوں کی برابر ہیں قطاریں جاتیں — جس طرح دشت میں ہرنوں کی ہیں ڈاریں جاتیں
پل ہیں بے کشتی و پل پار اُتر جاتے ہیں — سفری سیکڑوں بے لاگ گزر جاتے ہیں
روئے دریا پہ گزر مثلِ نظر ہوتا ہے — ایسے جاتے ہیں کہ دامن نہیں تر ہوتا ہے

گلشنِ دانش و فرہنگ جو ہے ملکِ فرنگ — اے زمستاں ہیں وہاں تیرے عجب عیش کے رنگ
بارہ سنگے کہیں بگھی ہیں اُڑاتے جاتے — جلوہ تختِ ہوا دار دکھاتے جاتے
نوجواں ہیں کہ جوانی کی شرابوں سے ہیں مست — پہلواں ہیں کہ مئے بے جام شرابوں سے ہیں مست
ہے زمیں جوشِ دلی ہو صدا انگیزی میں — سب کمر بستہ ہیں میدانِ سبک خیزی میں

پاؤں کو کاٹ کے موزوں کو چڑھائے ہیں کھڑے
اور عصا اپنے سپر برف جمائے ہیں کھڑے

قدم آگے کو ریپٹ کر ہیں نکلنے جاتے
یہ اُچھل جاتے ہیں آگے کو پھسلنے جاتے

کوئی گر دوڑ میں جیتا کوئی ہارا ہوگا
پر ریپٹ دوڑ کا میدان نہ مارا ہوگا

بس کر اے دل کہ نہیں لکھنے کی طاقت باقی
مارے سردی کے نہیں ہاتھ میں حالت باقی

دیکھ کاغذ کا ورق ہاتھ میں تھراتا ہے
اور قلم ہاتھ سے ٹھٹھر کے گرا جاتا ہے

مارے سردی کے ہے سر اپنا جھکائے لینا
منہ ہے کاغذ کی رضائی میں چھپائے لینا

میرے اللہ تو ہی اب ہے بچانے والا
ترے آزاد کو جاڑے سے پڑا ہے پالا

آرزو کچھ نہیں دنیا کی رہی ہے دل میں
اب تمنا جو ہے باقی تو یہی ہے دل میں

طپشِ عشق سے دل رہوے مرا نرم سدا
گرمیِ شعر و سخن سینہ رکھے گرم سدا

مثنوی مصدرِ تہذیب

زمیں پہ مہر کی جس دن کہ تھی نظر پہلی
اور آفرینشِ عالم کی تھی سحر پہلی

مزاج جملہ عناصر کا اعتدال پہ تھا
اور اعتدال سے جو کام تھا کمال پہ تھا

...صبح خلق میں بنیاد تھی زمانے کی — اور ابتدا تھی زمانہ کے کارخانہ کی
...افق میں تھا کوئی کا نور اُڑا رہا گویا — زمیں سے تا بفلک نور اُڑا رہا گویا
...کنارِ کوہ پہ سورج تھا دیتا دکھلائی — کہ جیسے گیند طلائی ہوا میں لڑکا لی
...دکھا کے گوشۂ ابرو ذرا چمک جانا — لحافِ ابر میں منہ دیکے پھر دبک جانا
...کبھی پہاڑ پہ سر بھی اُبھار لیتا تھا — شفق کے خون میں پھر غوطہ مار لیتا تھا
...وہ دن جہاں میں تھا نوروزِ روزگار کا دن — جدھر کو دیکھئے گویا کہ تھا بہار کا دن
...ہوا میں فیضِ مسیحا کی شان تھی گویا — کہ آتی قالبِ بیجاں میں جان تھی گویا
...پڑے جھلکتے نگاہوں کے ایاغ تھے سارے — کھڑے لہکتے جوانانِ باغ تھے سارے
...سحر کا فیض جو ہر خشک و تر پہ طاری تھا — تو آبِ بحر بھی کس کس مزے سے جاری تھا
...دلوں کو موج کے دریا میں اضطراب نہ تھا — ہوا کے صدمہ سے رکھتا خطر حباب نہ تھا
...نہ خوفِ لطمۂ گرداب غوطہ بازوں کو — نہ فکر بادِ مخالف کا تھا جہازوں کو
...تو اپنی حد سے ہوا کچھ زیادہ ہوتی تھی — تو ناخداؤں کو بادِ مراد ہوتی تھی

...تنا سبزۂ قدرت سے لہلہاتی تھی — صبا جو اس پہ گزرتی تو لوٹ جاتی تھی
...تمام دشت چمن در چمن پڑے ہوئے تھے — پہاڑ بھی لوٹتے ان بھرے کھڑے تھے

...تعارفِ عہد کا تھا ہر جگہ پہ کام جدا — ہر ایک شاخ میں کرتی تھی اہتمام ہوا

ہوا میں چمپل کے شش تھی اُڑا دیتی — زمیں پہ چادر مہتاب تھی بچھا دیتی
جو میں سنا کے [illegible] کو [illegible] بناتی تھی — ہوا کے [illegible] بالاگوں بناتی تھی

[illegible] تھی [illegible] — [illegible] تھی دل [illegible] میں [illegible] اسکی
[illegible] — [illegible] کے [illegible] گیا [illegible]
[illegible] کے تاب [illegible] تھی — [illegible] آب دیتی تھی

[illegible] — [illegible] مذاق سے ترجا بجا جاری
[illegible] دولت [illegible] — [illegible] گنبد [illegible] یہ صدا
[illegible] سعادت [illegible] آتی ہے — [illegible] عیاں شان کبریائی ہے

صدا کے ساتھ اٹھے سب کے خواب آگیں تھے — دلوں [illegible] آنکھیں
نظر اٹھا کے جو دیکھا عیاں ہے نام خدا — کمال [illegible] فیض کا وہ بہر بندگان خدا
جلو میں ہے ملک اقدس کا دست بر سر پر — نگاہ ذرہ و خورشید سے لبوں پہ [illegible]
الٰہ ذات مقدس ہے اس کی ذات کمال — کھڑے ہیں دست ادب باندھے سب صفات کمال
صفات ذات ارکین دولت اسکے تھے — بنائے دولت ساماں جو [illegible] اسکے تھے

لباسِ فیضِ سحر تھے دلوں پہ چھائے ہوئے　　ظہورِ قدرتِ حق آنکھوں میں سمائے ہوئے
تھی اعتدال پہ جو واں کی بات ہوتی تھی　　نہ دھوپ تیز نہ تاریک رات ہوتی تھی
شعاعِ مہر زیادہ چمک نہ سکتی تھی　　اور اس کی نوکِ نگہ بھی کھٹک نہ سکتی تھی
کرن ہو تیز تو تھی دھوپ ڈال سے بٹ جاتی　　بہت ہو ہوتی اندھیری تو رات کھل جاتی

رواج عیب کا جاتا وہاں چراغ نہ تھا　　دھواں بدی کا پہنچتا سپہ دماغ نہ تھا
حرارت دن کا برابر تھا حساب وہاں　　ہمیشہ رہتا تھا میزان میں آفتاب وہاں
ہوا کے واں چلن آکر درست ہوتے تھے　　جو صرصر آتے تو زور اُس کے سست ہوتے تھے
کبھی نسیم تھی آتی کبھی صبا آتی　　اور اس روش سے وہ پھولوں کو تھی سجا جاتی
کہ آب و رنگ جہاں رونقِ بہار سے ہو　　نہ گل کے پاؤں کو صدمہ نوکِ خار سے ہو

جو بار طبع تھے واں آکے سیدھے چلتے تھے　　اور اُن کے نکلے کی مانند بل نکلتے تھے
زیادہ ظلم کو واں اعتدال سے تھے گویا　　جو بد تھے نیک باصلاح حال تھے گویا
جو بد مزاج تھے واں خوش مزاج ہوتے تھے　　سبھوں کی رنج روشنی کے علاج ہوتے تھے

وہ شاہ لطف سے تھا کرتا جہاں پہ نظر　　کبھی عیاں پہ نظر تھی کبھی نہاں پہ نظر
خدا کے بندوں پہ الفت زبس تھی عام اُس کی　　فروغ عام تھی مثلِ مہِ تمام اُس کی

وہ جوشِ اُلفتِ دل کام کیے کے پردہ میں — یکایک آنکھوں سے نکلا نظر کے پردہ میں
تھا حسنِ خلق جو پھیلا رہا شمیم اس کی — اُسی پہ خاص ہوئی الفتِ عمیم اُس کی
دیا یہ حکم کہ تم سوئے خلق جاؤ ذرا — ہمارے لطف کا جلوہ انہیں دکھاؤ ذرا
دلوں کی مملکتوں کا خراج اُس کو دیا — بہارِ گلشنِ جنّت سے تاج اسکو دیا
ہر ایک پھول کو سو رنگ و بو سے چمکا کر — اور اس پہ شبنمِ آبِ حیات برسا کر
کیا بجانبِ ملکِ فنا روانہ اُسے — کہ ہو قیامِ قیامت تلک فنا نہ اُسے

غرض کہ خسروِ اخلاق خلق میں آیا — شمیمِ خلق سے باغِ جہان مہکایا
یہ حُسنِ خلق سے تسخیر کر لیا سب کو — کہ جیسے بستۂ زنجیر کر لیا سب کو
بہارِ خلق سے اُس کے ہوا چمن عالم — اور اُس کے نور سے انجم کی انجمن عالم
شگفتہ روئی پہ صدقے بہار ہوتی تھی — دہن پہ خندہ جبینی نثار ہوتی تھی
وہ مُنہ سے بات جو کرتا تو پھول جھڑتے تھے — جو چپ رہے تو چمن آ کے پاؤں پڑتے تھے
کیا نہ دل میں بد و نیک کا خیال اُس نے — ہر اک کو کر دیا خوشحال حسبِ حال اُس نے
جہاں میں بحرِ کرم اس کی ذات تھی گویا — وہ ذات چشمۂ آبِ حیات تھی گویا
رہا نہ بسکہ نہ محروم اس ابرِ نیساں سے کوئی — پھرا نہ خلق سے ناکام اُسکے در سے کوئی
تو مدح خواں ہوئے سب اہلِ روزگار اسکے — دیئے زمانے میں شہرت نے اشتہار اسکے
اُمنڈ کے لوگ یہ نزدیک و دور سے آئے — کہ جیسے مور و ملخ ہوں وفور سے آئے

وہ اُس کے بندۂ بے دام ہو گئے سارے — غلام خاص سے تا عام ہو گئے اُس کے
درِ امید کھلا تھا ہمیشہ سب کے لئے — نہ حکم خاص تھا دربان نہ قید شب کے لئے
اگرچہ بہر بد و نیک تھا کھلا دربار — دلِ سخی کی طرح تھا ہمیشہ وا دربار
زیادہ سب سے قباحت یہ ہو بکار آئی — کہ بزم جشن میں خلقت جو ایکبار آئی
تو خاص و عام یہاں آکے باریاب ہوئے — سبھوں کو واں ملا خلعت و خطاب ہوئے
انہی میں ہزل و تمسخر کے بھانڈ بھی آئے — ظرافتوں نے بہت باغ سبز دکھلائے
لطائف انکے یہ دربار کو پسند ہوئے — کہ شاہ کی خدمتِ عالی میں سربلند ہوئے
رہے جو خلوت و جلوت میں روز و شب اجل — مصاحبوں میں ہوئے رفتہ رفتہ سب اجل
غرضکہ ہزل و تمسخر ہوئے وزیر اسکے — بہت سے اہلِ ظرافت ہوئے امیر اُس کے
اثر زمانے پہ اُس کا مگر بجا نہ ہوا — جو اُس کو مدِ نظر تھا وہ مطلقاً نہ ہوا
ادب کے طور طریقے بگڑ گئے اُن کے — قدم طریق وفا سے اکھڑ گئے اُن کے
رہا دلوں پہ نہ رعب اس کی حکمرانی کا — سمجھ کے پی گئے سب اُسکو گھونٹ پانی کا
حیاء شرم و ادب سے خلاف کرنے لگے — ادب کے قاعدوں سے انحراف کرنے لگے
وہ حسنِ خلق تمسخر کا نام رکھتے تھے — جو بات کہتی نصیحت تو نام رکھتے تھے

وہ دیکھا خسروِ اخلاق نے جو حال اُن کا — اور اُن کے حال نے دکھلا دیا مآل اُنکا
اگرچہ خلق و مروت کا بادشاہ تھا وہ — اور ایسی باتوں پہ رکھتا نہ کچھ نگاہ تھا وہ

پر اس نے دیکھا کہ ان میں وفا نہیں باقی　　اور انکی آنکھ میں شرم و حیا نہیں باقی
نظر کیا ملکِ القدس کو یہ حال اُن کا　　لکھا کہ حال سراسر ہے پُر وبال اُن کا
شتاب چشمِ کرم سے اُنکی وہ جاتے　　کہ روز نامۂ جہاں رو براہ ہو جاتے
غرض جو تھی شہِ اخلاق نے لکھی عرضی　　وہ بزمِ قدس میں ساری پڑھی گئی عرضی
وہاں نگاہ توجہ کمال اُس پہ ہوئی　　بہت سی تہنیتیں تجلی تعالیٰ اس پہ ہوئی
بدل کی ساری بدشعاریاں بھی دیکھی تھیں　　خرابیوں کی ستمگاریاں بھی دیکھی گئیں

غرض کہ بزمِ مقدس میں گفتگو کر کے　　ہر اک کے ظاہر و باطن میں جستجو کر کے
کھلا کہ ہو گئے بیباک یہ جو سارے ہیں　　اور اس میں سارے بداعمالیوں کے مارے ہیں
تو بے سبب نہیں گستاخ بن گئے ہیں یہ　　یہ حسنِ خلق کے ہیں سارے گل کھلائے ہوئے
سو قوتِ غضبی کو ذرا اشارہ ہوا　　کہ ساتھ اس کے عمل میں حکومت آرا ہو
وہ حسنِ خلق سے بل کر دوا کا کام کیے　　جو دل مریض ہیں ان پہ شفا کا کام کیے

غرض کہ قہر کو فرمانِ خسروانہ ہوا　　بلا کی طرح سے وہ دفعتہً روانہ ہوا
چلا وہاں سے مگر اس کر اک دبک سے چلا　　کہ جیسے شعلۂ باروت ہو بھڑک کے چلا
بسانِ اژدرِ خونخوار سر اٹھائے ہوئے　　اور اسپہ کلّۂ شیرِ سیہ چڑھائے ہوئے
قضا نے آگ کے سانچے میں اسکو ڈھالا تھا　　جلا ہوا تھا دل ایسا کہ رنگ کالا تھا

یہ تن پہ لپٹے تھے غیظ و غضب کے مارے بال — کھڑے تھے شیر کی مونچھوں کی طرح سارے بال

تھے مارے طیش کے نتھنے پھڑک رہے دونو — برنگ شعلہ تھے دیدے چمک رہے دو[نو]

یہ پیچ و تاب میں تھا اپنے زہر کا مارا — کہ دانت پیستا آتا تھا قہر کا مار[ا]

غضب سے چہرے پہ گویا جنوں برستا تھا — جو دیکھتا تو نگاہوں سے خوں برستا تھ[ا]

گرج تھی ابر کی اور آندھی اسکے ساتھ میں تھی — بجائے تیغ کڑک بجلی اسکے ہاتھ میں تھی

خود اک بگولے کے اوپر سوار آتا تھا — غبار آگے اڑاتا شرار آتا تھا

غرض کہ آیا اور اس آن بان سے آیا — کہ جیسے قہر خدا آسمان سے آیا

وہ اس کا آنا جہاں پر غضب کا آنا تھا — نہ اس کا نیک تھا اپنا نہ بد بیگانا تھا

پڑے تھے تہلکے دنیا کے کارخانے میں — اور اس کے آنے سے بھونچال تھے زمانے میں

وہ دیو ہزل و تمسخر جو تھے وزیروں میں — اور ان کے ساتھ ظرافت کہ تھی امیروں میں

سب ایسے بھاگے کہ ان کا کہیں نشاں نہ ملا — سر زمیں نہ ملا زیر آسماں نہ ملا

بہت سے لوگ مقام حساب میں آئے — بہت سے ترک ادب کے عتاب میں آئے

چھٹے سب پہ ادب کے جو تازیانے لگے — تو مارے ڈر کے جگر سب کے تھرتھرانے لگے

ہزاروں پھبتیوں سے پٹ کے فرش خاک ہوئے — ہزاروں خنجر تعزیر سے ہلاک ہوئے

بہت سے اپنے کئے کی سزاؤں میں آئے — بہت کئے نہ کئے کی بلاؤں میں آئے

پر اسکے ڈر سے کوئی دم بھی مار سکتا نہ تھا — جو روتی آنکھ تو نالہ پکار سکتا نہ تھا

[illegible] دیکھا کہ ان میں وفا نہیں باقی ۔ اور ان کی آنکھ میں شرم و حیا نہیں باقی
[illegible] غذیں کو یہ حال ان کا ۔ لکھا کہ حال سراسر ہے پر وبال ان کا
[illegible] سے ان کو وہ ہو جائے ۔ کہ نور تا نہ جہاں رو براہ ہو جائے
[illegible] اخلاق نے لکھی عرضی ۔ وہ بزم قدس میں ساری پڑھی گئی عرضی
[illegible] توجہ کمال اس پہ ہوئی ۔ جہت ہی ندیہ نہیں قبل قال اس پہ ہوئی
[illegible] بدکاریاں بھی دیکھی گئیں ۔ فرشتوں کی ستمگاریاں بھی دیکھی گئیں

[illegible] قدس میں گفتگو کر کے ۔ ہر اک کے ظاہر و باطن میں جستجو کر کے
[illegible] مبارک یہ جو سارے ہیں ۔ اور ان میں سارے بداعمالیوں کے مارے ہیں
[illegible] نہیں گستاخیں آتے ہوئے ۔ یہ حسن خلق کے ہیں سارے گل کھلائے ہوئے
سو قوت [illegible] کو ذرا اشارہ ہوا ۔ کہ ساتھ اس کے عمل میں حکومت آرا ہو
یہ حسن خلق سے مل کر دوا کا کام کرے ۔ جو دل مریض ہیں ان پہ شفا کا کام کرے

غرض کہ قہر کو فرمان خسروانہ ہوا ۔ بلا کی طرح سے وہ دفعتہً روانہ ہوا
چلا وہاں سے مگر اس کڑک دمک سے چلا ۔ کہ جیسے شعلہ بارود ہو بھڑک کے چلا
بسان اژدر خونخوار سر اٹھائے ہوئے ۔ اور اسپ کلۂ شیر پہ چڑھائے ہوئے
تھا نہ آگ کے سانچے میں اسکو ڈھالا تھا ۔ جلا ہوا تھا دل ایسا کہ رنگ کالا تھا

یہ تن پہ لپٹے تھے غیظ و غضب کے مارے بال — کھڑے تھے شیر کی مونچھوں کی طرح سارے بال
تھے مارے طیش کے نتھنے پھڑک رہے دونو — برنگِ شعلہ تھے دیدے چمک رہے دونو
یہ پیچ و تاب میں تھا اپنے زہر کا مارا — کہ دانت پیستا آتا تھا قہر کا مارا
غضب سے چہرے پہ گویا جنوں برستا تھا — جو دیکھتا تو نگاہوں سے خوں برستا تھا
گرج تھی ابر کی اور آندھی اسکے ساتھ میں تھی — بجائے تیغ کڑک بجلی اسکے ہاتھ میں تھی
خود اک بگولے کے اوپر سوار آتا تھا — غبار آگے اڑاتا شرار آتا تھا
غرض کہ آیا اور اُس آن بان سے آیا — کہ جیسے قہرِ خدا آسمان سے آیا
وہ اُس کا آنا جہاں پر غضب کا آنا تھا — نہ اُس کا نیک تھا اپنا نہ بد بیگانا تھا
پڑے تھے تہلکے دُنیا کے کارخانے میں — اور اس کے آنے سے بھونچال تھے زمانے میں
وہ دونو ہزل و تمسخر جو تھے وزیروں میں — اور اُن کے ساتھ ظرافت کہ تھی ا
سب ایسے بھاگے کہ ان کا کہیں نشان نہ ملا — سرِ زمیں نہ ملا زیرِ آسمان
بہت سے لوگ مقامِ حساب میں آئے — بہت سے ترکِ ادب کے عتاب میں آئے
پٹخنے سب پہ ادب کے جو تازیانے لگے — تو مارے ڈر کے جگہ سب کے تھرتھرانے لگے
ہزاروں قمچیوں سے پٹ کے فرشِ خاک ہوئے — ہزاروں خنجرِ تعزیر سے ہلاک ہوئے
بہت سے اپنے کیے کی سزاؤں میں آئے — بہت سے کیے نہ کیے کی بلاؤں میں آئے
پر اسکے ڈر سے کوئی دم بھی مار سکتا نہ تھا — جو روئی آنکھ تو نالہ پکار سکتا نہ تھا

اگرچہ جو تھا جہاں میں غضب کا مارا تھا
اور اس پہ قہر جو تھا سب پہ آشکارا تھا

پہ شکوہ کر نہیں سکتے تھے زینہار اس کا
نہ حال لکھ سکتے تھے اخبارِ روزگار اس کا

مگر وہ شاہ کہ تھا جس پہ کل کا حال کھلا
اور انکے حال میں اک اک کا تھا مآل کھلا

نہ اپنے بندوں کا یہ حالِ زار دیکھ سکا
نہ دردِ غم سے انہیں داغدار دیکھ سکا

کیا اشارہ یہ تہذیب کو کہ جاؤ ابھی
اور اعتدال پہ انکے دلوں کو لاؤ ابھی

اُدھر سے جب یہ عنایاتِ خسروانہ ہوئی
تو بزمِ قدس سے تہذیب ادھر روانہ ہوئی

وہ سوئے اہلِ زمیں ایسی شان سے اُتری
کہ جیسے رحمتِ حق آسمان سے اُتری

نہ اسکے تاجِ درِ شہوار تھا سر پر
نہ کوئی چترِ جواہر نگار تھا سر پر

مگر عمامۂ خاص اسکو مشتری نے دیا
اور اپنا چتر تھا طالع کی یاوری نے دیا

تھے وہ جو علم نے خلعت اسے پنہائے ہوئے
اور اسکے قامتِ موزوں پہ ٹھیک آئے ہوئے

اثر عدو کے خدنگِ کلام کرتے نہ تھے
اور اعتراضوں کے تیر اُن پہ کام کرتے نہ تھے

کلام ہاتھ میں تھا آگے تیغ تیز لئے
تھے جوہر اس میں سخنہائے شعلہ ریز لئے

بنائی آئی تھی تدبیر سارے کام اسکے
خرد بھی کر رہی پردے میں انتظام اسکے

تھی صنعت اپنی گلِ تر بکھیرتی آتی
اور اُن کا رنگ زمانہ میں پھیرتی آتی

اسی کے رنگ میں دولت تھی جگمگاتی ہوئی
کہ دونوں ہاتھوں سے تھی سیم و زر لٹاتی ہوئی

...ال سے جبکہ زمیں پہ وہ نیک نام آتی — لئے جہان میں آرام خاص و عام آتی
...میں محاسن اخلاق بڑھ کے ساتھ ہوتے — جھکا کے غیظ و غضب سر کو ساتھ ساتھ ہوتے
...وہ آپ نیکی آئی تھی تمکنت کی چھڑی — کہ تمکنت کی چھڑی تھی وہ سلطنت کی چھڑی
...بات ہر کس و ناکس سے بھی ذرا کرتی — وزیر عقل سے تھی گر کبھی مشورہ کرتی
...و حلم کچھ سر دربار بر ملا ہوتے — تو اس کی کم سخنی میں سخن ادا ہوتے
...تھی دوربیں کی جگہ ہاتھ میں لئے اخبار — جہاں کی سیر تھی اسکو دکھا رہے اخبار
...خلاف وضع نہ تھی بات مطلقاً کرتی — ہنسی کے حق کو تبسم ہی تھی ادا کرتی

غرض کہ پہلے ہی جو اُس نے جشن عام کیا — تو نظم خلق کا پہلا یہ انتظام کیا
کہ مدرسے ہیں جو عالم میں جا بجا جاری — یہ حکم اُن میں بتاکید ہو نیا جاری
کہ لڑکے یاں کے جو محنت زیاد کرتے ہیں — زباں سے لفظ و معانی کو یاد کرتے ہیں
مگر دلوں پہ اثر اُن کے زینہار نہیں — اور اُن پہ رکھتے یقیں اہل روزگار نہیں
اگر دلوں پہ اثر ہو تو کیوں عمل نہ کریں — بدی کو اپنی وہ نیکی سے کیوں بدل نہ کریں
یہ حکم آج سے ہو جائے عام عالم میں — اور انتظام ہو اس کا تمام عالم میں
کہ لفظ جیسے زبانوں پہ ہیں رواں ہوتے — یہ اُنکو منہ سے ہیں بک بک کے بیجاں ہوتے
اب اُنکے ساتھ مطالب کے بھی اثر ہوویں — دلوں میں اُنکے یقیں کرتے گھر ہوویں

یہ حکم جب ہوا دربارِ شاہ سے جاری — ہوا نہ تھا ابھی دفتر کی راہ سے جاری
اِدھر اُدھر کہ جو گھاتوں میں تھے لگے اخبار — وہاں زباں بزباں اسکے لیے اُڑے اخبار
ہوا یہ اتنے میں اک حکم دوسرا جاری — کہ جلسے انجمنوں کے ہیں جابجا جاری
نہ انکی باتیں زبانوں پہ منحصر ہوویں — وہ سب رسالوں میں چھپ چھپ کے مشتہر ہوویں
کہ ان کا فیضِ مقاصد ہو عام عالم میں — رہیں علوم کے چرچے تمام عالم میں
ولیکن ان کو بھی تاکید یہ زیادہ ہو — کہ فائدہ کی جو کچھ بات دل نہادہ ہو
باتفاق اسے مل جل کے رو براہ کرو — اور اختلاف سے کاموں کو مت تباہ کرو

مثنوی شرافتِ حقیقی

میں پوچھتا نہیں ہرگز تمہارا نام ہے کیا — نہ یہ کہ نام بزرگوں کا اور مقام ہے کیا
نہ خانوادے سے مطلب نہ خانماں سے غرض — یہاں تو نام سے کچھ ہے نہ کچھ نشاں سے غرض
تمہارے کام گر اچھے تو نام اچھے ہیں — گھرانے اچھے، گھر اچھے، تمام اچھے ہیں

جہاں کی دولت و حشمت کا یاں خیال نہیں — امیر ہو کہ فقیر اس سے کچھ سوال نہیں
کوئی امیر اگر ہے تو اپنے گھر بیٹھے — بزرگ صاحبِ زر ہیں تو لے کے زر بیٹھے

بیاں تو مایہ ہمت میں جو زیادہ ہے — بزرگ امیر سمجھتے اور خود امیر زادہ ہے

مجھے نہیں ہے یہ پروا کہیں سے آئے کوئی — کہیں سے بار زر و مال اٹھا کے لائے کوئی
جو پاک نہر ہے اور آپ صاف چلتا ہے — تو کیوں یہ پوچھیں کہ چشمہ کہاں نکلتا ہے
غرض ہے نہیں کچھ کام جس کے پھول ہو تم — کمال اصل تو جب ہے کہ با اصول ہو تم

عدم سے آن کے کس خاک پر گرے پہلے — وہ کیا زمین تھی جس پر قدم پھرے پہلے
گزارا تم نے لڑکپن ہے قصر شاہی میں — کہ جھونپڑوں میں پلے خواری و تباہی میں
مجھے نہ فخر ہے اس کا نہ عار ہے اسکی — مگر تلاش ہے تو بار بار ہے اس کی
کہ رکھتے ملک مروت میں رسم و راہ ہو کیا — دکھاتے ہمت عالی ہیں دستگا

میں پوچھتا نہیں تاجر کہاں سے ہے آیا — گماشتہ ہے کہ رکھتا ہے گھر کا
نہیں تلاش کہ لایا ہے ساتھ کیا چیزیں — سبک سبک ہیں یا ہیں گرانبہا
میں چاہتا نہیں ارزاں یہ شے دلا دو مجھے — خدا کے واسطے اتنا کوئی بتا دو سب
متاع حسن دیانت دکاں میں ہے کہ نہیں — وفا کی جنس بھی اس کلمہ دان میں ہے کہ نہیں

یہ مانا میں نے کہ با عقل و ذی شعور ہو تم — مقام تجربہ کاری میں پہنچے دور ہو تم

نہ کچھ قدر مرضی ست ... تھا تو مجرم ہوں میں   نہ کرتا ضابطہ دانی میں کچھ کلام ہوں میں
پھر اس او خود بہشتی ہیں نہ خرچ کیا تم   کسی کے خون میں ہاتھ نہ ہاتھ بھرنا تم
زیادہ عقل زیادہ ثواب لرزتی ہے   ثواب پاتے خدا کو عذاب کرتی ہے

تجھے غرض نہیں کتابیں تم پڑھتے کہ نہیں   جو آخرت کے مدارج پہ تم چڑھتے کہ نہیں
کتابیں پڑھ کے جو لیں حفظ بر زبان تو کیا   نزول میں پاس تجھے دیکھے امتحان تو کیا
تمہارے خلق پہ کچھ بھی اثر ہوا کہ نہیں   زبان سے کہنے کی دل تک گئی صدا کہ نہیں
خدا جو عالم ذی شان ہو گئے تو کیا   مرے حسابوں وہ شیطان ہو گئے تو کیا

جو کچھ کہ منہ سے کہو اس کا ہو اثر دل میں   کہ ہے کتابوں میں جو کچھ کہے وہ گھر دل میں
زبان و دل ہیں بہم جب یہ ایک ہو جاتے   تو آدمی بھی ہیں بالطبع نیک ہو جاتے
وگرنہ پڑھنے کو سب خاص و عام پڑھتے ہیں   ہزاروں طوطے ہیں کلمہ کلام پڑھتے ہیں

جو مجھ سے پوچھو تو پھر بھی ہے ناتمام وہ علم   تمام جب ہو کہ پہنچائے فیضِ عام وہ علم
وہ علم جس سے کہ اوروں کو فائدہ نہ ہوا   ہمارے آگے برابر ہے وہ ہوا نہ ہوا

تجھے غرض نہیں سب کچھ ہو تم کہ کچھ بھی نہ ہو   مگر یہی ہے تمنا کہ ایسے ہونکے نہ ہو

ن جلسہ جو آزاد پوچھے آکے کبھی — کہو کسی میں لیاقت ہو گر یہ کہنے کی
ا صفا و سبک روح و پاک جاں ہم ہیں — تو تم جواب میں جھٹ بول اٹھو کہ ہاں ہم ہیں

معرفتِ الٰہی

آؤ آزاد بیٹھے کیا ہو خموش — فصلِ گل آئی ہے بجوش و خروش
کیا پڑے کنجِ غم میں ہو بیکار — گل و گلشن کی چل کے دیکھو بہار
لطفِ صحبت بہم غنیمت ہے — میاں آزاد دم غنیمت ہے
چل کے دیکھو ذرا چمن کی سیر — گل و گلزار و یاسمن کی سیر
گرچہ بہر عوام کالانعام — لطفِ گلگشت ہو گیا بدنام
پر کرو دل میں تم جو اپنے غور — ہے ہر اک امر کا علیحدہ طور
نیک و بد پر اگر نظر ہے شرط — قصد کا اپنے بھی اثر ہے شرط
سیکڑوں چیزیں اس جہاں میں ہیں — کہ بری خلق کے گماں میں ہیں
صرف ہوئے گر اس میں حسنِ خیال — تو ہو پھر نقص اس کا عینِ کمال
گل و سنبل سے تا خس و خاشاک — خاک سے تا بہ گلشنِ افلاک
رکھتے جو لوگ ہیں نظر عالی — نہیں عبرت سے کوئی شے خالی

ہر ورق ہے شجر پہ بہرِ حساب — بکفِ دستِ موعظت کی کتاب
گوشِ عبرت نہیں تو کھولنا ہے — ورنہ ہر برگ یاں کا بولتا ہے
ہر زباں برگ گوشِ دل گل ہے — تو ہی مدہوشِ نشۂ مُل ہے
ایک دن دل جو میرا گھبرایا — کلبۂ غم سے میں نکل آیا
دل تھا پژمردہ غنچہ وار مرا — ہُوا گلزار میں گزار مرا
پھرتے پھرتے جو دل میں کچھ آیا — پا کے اک جادرخت کا سایا
بیٹھا میں بر کنارِ آبِ رواں — کہ ہے عمرِ رواں، حبابِ رواں
کی جو یکبار آنکھ اٹھا کے نظر — برگ اک ٹوٹ کر زِ شاخِ شجر
اُترا اُوپر سے جوں پیامِ سروش — اور ہوا میری زینتِ آغوش
گرچہ گویا نہ تھی زبانِ مقال — پر وہ کہتا تھا فی لسان الحال
کہ اگر تجھ کو چشمِ بینا ہے — تو یہ قدرت کی لوحِ مینا ہے
نہیں مجھ میں ہے یہ رگ و ریشہ — دیکھ ان کو بہ چشمِ اندیشہ
صانعِ غیب کا ہے کارِ بدیع — کلکِ صنعت کا ہے نگارِ بدیع
روئے ہستی پہ تھا نہ نام مرا — تھا رگِ شاخ میں مقام مرا
فیضِ آب اور باد کی نرمی — اس کی نرمی و مہر کی گرمی
تا درِ خاک سے ہوئے دوچار — رُوحِ جنبش میں آگئی یکبار
منہ کو گردِ عدم سے صاف کیا — سینۂ شاخ کو شگاف کیا

سبزۂ کونپل تھا جب نکالا سر | پردۂ کونپل تھی غیرتِ گلِ تر
کھائی جو میں نے اس چمن کی ہوا | دیا شاخ و شجر کو برگ و نوا
میرا یُمنِ قدم یہ آیا راس | ہوگیا ہر درخت خضر لباس
زاد و برگِ شجر ہوا مجھ سے | گل کا آباد گھر ہوا مجھ سے
بار مجھ میں نہ زینہار آتا | پہلے برگ آتا پیچھے بار آتا
تاجِ سر میں سپے نہال ہوا | مجھ سے سارا چمن نہال ہوا
خسروِ گل کا جب قشون آتا | میرا پرچم تھا پہلے لہراتا
سب کے سر پہ تھا نخل کا سایا | میرا سایا تھا نخل پر چھایا
جس سے سارے جہان کو راحت تھی | ہر مسافر کو استراحت تھی
شاخِ گل تھی ہری بھری مجھ سے | زیب و زینت چمن کی تھی مجھ سے
تھی رفاقت سے میری سروِ آزاد | مجھ سے زیبا تھا طرۂ شمشاد
چشمِ نرگس چمن کا جوبن تھی | برگ گویا زبانِ سوسن تھی
ساری ذات و صفات ہیں مجھ میں | گل میں جو کچھ ہے بات ہے مجھ میں
کونسی بات مجھ سے چھوٹی ہے | مجھ میں اکسیر تک کی بوٹی ہے
مرہمِ زخمِ جان و خاطرِ ریش | برگِ سبز است تحفۂ درویش

ہر خزاں کو بہار لازم ہے
ہست کو نیستی ملازم ہے

اُولو العزمی کے لئے کوئی سدِّ راہ نہیں

ہے سامنے کھلا ہوا میداں چلے چلو
باغِ مراد ہے ثمر افشاں چلے چلو
دریا ہو بیچ میں کہ بیاباں چلے چلو
ہمّت یہ کہہ رہی ہے کھڑی ہاں چلے چلو
چلنا ہی مصلحت ہے مری جاں چلے چلو

ہیں کوہ و دشت جیسے کہ پھولا پھلا چمن
دامن میں ہیں بھرے ہوئے نسرین و نسترن
نہریں اِدھر اُدھر ہیں امیدوں کی موجزن
اس دشت میں نہ دوڑ سکو بن کے گر ہرن
کبکِ دری کی طرح خراماں چلے چلو

آؤ کہ کھولے اپنے نشاں ننگِ نام نے
باندھی کمر ہے کس کے ہر اک شاد کام نے
کیوں اس طرح کمر کو لگے تھک کے تھامنے
دیوارِ باغ وہ نظر آتی ہے سامنے
سروِ سہی کے سر ہیں نمایاں چلے چلو

یارو چلو چلو، نہ کرو انتظار تم
کرتے ہو کیا امید یمین و یسار تم
میدانِ عزم و جزم کے ہو شہسوار تم
بڑھ جاؤ گے کہ ہوسکے اگر بار بار تم
چلّا رہی ہے ہمّتِ مرداں چلے چلو

ہمّت کے شہسوار جو گھوڑے اٹھائینگے
دشمن فلک بھی ہونگے تو سر کو جھکائینگے
طوفان بلبلوں کی طرح بیٹھ جائینگے
بجلی کے زور اٹھ کے بدی کو دبائینگے

بیٹھو نہ تم مگر کسی عنواں سے چلے چلو

آئینہ دل کا گردِ سفر سے اُجال دو — پوچھے کوئی ارادہ کدھر ہے تو ٹال دو
شیطاں جو شبہ ڈالے تو دل سے نکال دو — ہو خوف کا خیال تو بزدل پہ ڈال دو
اور آپ بن کے شیرِ نیستاں چلے چلو

رکھو رفاہ قوم پر اپنا مدار تم — اور ہو کبھی صلے کے نہ امیدوار تم
عزّت خدا جو دیوے تو پھر کیوں ہو خوار تم — دو رُخ کو آبِ فخر سے رنگِ بہار تم
گلشن میں ہو کے بادِ بہاراں چلے چلو

یارو چلو فلک پہ ستارے ہیں چل رہے — آبِ رواں ہیں چشموں سے بہ کر نکل رہے
جنگل میں کارواں کبھی ہیں منزل بدل رہے — جو تھم رہے وہاں وہی خر در وحل رہے
تھمنے کا یہ مقام نہیں ہاں چلے چلو

آؤ سیہ سفید کا فیصل حساب ہے — چمکایا چہرہ صبح نے باآب و تاب ہے
ظلمت پہ نور ہونے لگا فتحیاب ہے — اور شب کے پیچھے تیغ بکف آفتاب ہے
تم بھی ہو آفتابِ درخشاں چلے چلو

نیکی بدی کے دیر سے باہم تھے معرکے — اب خاتموں پہ آگئے ہیں اُنکے فیصلے
قسمت نے بد نوشتے نہیں جو نہ مٹ سکے — وہ گونجا طبلِ فتح کہ میدان لے لئے
ہے کرناے جنگ کی الحاں چلے چلو

سلام علیک

تماشا کی نظر آ رہی شان ہے
سہانا سا اک سبز میدان ہے

ہوا سے جو سبزہ ہے لہرا رہا
تو ہے دیکھنے سے مزا آ رہا

ہری گھاس وہ لہلہاتی ہوئی
ہوا لوٹ کر لہر کھاتی ہوئی

کوئی دل جو مٹی میں ہے مل گیا
تو اک آدھ گل ہے کہیں کھل گیا

وہیں ایک پیارا سا تالاب ہے
کہ دن دھوپ اور رات مہتاب ہے

یہ سبزی اسی کے کنارے پہ ہے
درختوں کا جھرمٹ کنارے پہ ہے

لب آب جھومیں شجر جیسے مست
وہ ہیں جھک کے پانی کا منہ چومتے

سماں آج کل ہے گا برسات کا
مزا دن کا ہے لطف ہے رات کا

درخت اک جگہ ہیں جو چھائے ہوئے
ہوادار بنگلے بنائے ہوئے

تو اک چھوٹے لڑکے نے واں آن کر
جگہ خوب موقعے کی پہچان کر

رکھا سامنے اپنے جزدان ہے
ورق پر لگائے ہوئے دھیان ہے

بہت لکھنے پڑھنے کا ہے ذوق اسے
یہی ذوق ہے اور یہی شوق اسے

ابھی ہیگا دن بس گھڑی چار ہیں
گئے سیر کو اس کے سب یار ہیں

ولیکن وہ ہر صبح یا شام ہے
شب و روز اسے کام سے کام ہے

اسی شغل میں اب بھی مشغول ہے — بنا بیٹھا اک مرد معقول ہے
خدا جانے ہے ہاتھ میں کیا کتاب — کہ اسمیں ہے ڈوبا جو ماہی در آب
اور آتی ہے جوں جوں سیاہی پہ شام — وہ شوقین لڑکا بذوق تمام
جھکا جاتا ہے اس طرح غور سے — کہ کاغذ میں کیڑا ہو جس طور سے
نظر اس کی جب ترمرانے لگی — سیہ شام سرمہ اڑانے لگی
بہت بیٹھے بیٹھے جو تھا تھک گیا — اک انگڑائی لے کر وہ لڑکا اٹھا
ملا کر بہم چھوٹے چھوٹے سے ہاتھ — ملے چہرے پر لطف محنت کے ساتھ
تھا فارغ جو ہو کر اٹھا کام سے — تو پھولا برنگ شفق شام سے

لگا کہنے خوش ہو کے وہ خوش کلام
مبارک مبارک خوشا وقت شام

رکھا پھر کتابوں کو جزدان میں — ٹہلنے لگا آ کے میدان میں
لگی ٹھنڈی ٹھنڈی جو منہ پر ہوا — حواس اس کے آنے ٹھکانے ذرا
تھے دن کے تھکے ماندے جو جانور — وہ اپنے مقاموں میں سب آن کر
بہم مل کے آوازیں دینے لگے — بسیرے درختوں پہ لینے لگے
وہ مل جل کے آپس میں تھے بولتے — کہ اپنی خوش آوازیاں تولتے
درختوں پہ چڑیوں کی چوں چوں کہو — وہ سمجھو تو چہچہا دیتے جہاں کہیں
جو سبزے میں جھینگر تھے برسات کے — نئے چھیڑ انھوں نے بجائی سرنائی کے

کئی غول طوطیوں کے جھنکارتے — گئے سبز سبزا پیلے بل مارتے
تھا لڑکا بھی حیراں یہ کیا ہو گیا — کہ میداں کا سبزہ ہوا ہو گیا
کانوں میں سناٹے بھرتے ہوئے — وہ تھے اس طرح باتیں کرتے ہوئے

کہ خوش ہو کے بولا وہ رنگین کلام
مبارک مبارک خوشا وقتِ شام

کیا خاتمہ دن کا جب شام نے — تو لی گھر کی راہ اس خوش انجام نے
ادھر اور ادھر کو نظر ڈالتا — چلا جاتا تھا دیکھتا بھالتا
کہ کچھ گائیں بھینسیں ملیں راہ میں — پھریں جیسے گھر کی تھیں چاہ میں
ٹپکتی خوشی صورتِ حال سے — عجب جا رہی تھیں لٹک چال سے
بھرے دودھ سے تھن لٹکتے ہوئے — کہ مشکیزے جیسے چھلکتے ہوئے
کئی ساتھ ساتھ انکے گوسالے تھے — کہ ماؤں نے تھن کے تلے پالے تھے
وہ اک گلہ باں پیچھے آتا ہوا — تھا الغوزہ اپنا بجاتا ہوا
ملیں راہ میں اسکو کچھ بکریاں — اور اک بوک بکرا رواں درمیاں
کئی بربری ان میں گلزار تھیں — پہاڑی تو دودھوں میں سرشار تھیں
وہ دودھل نہانی تھیں پوتوں بھلیں — کہ دن بھر تھیں چر چگ کے گھر کو چلیں
مچھلروں سے نیچے اچھلتے ہوئے — تھے اٹھکیلیوں سے مچلتے ہوئے
محبت سے ممیاتا جاتا کوئی — بہت تھک کے ماں کو بلاتا کوئی

انہیں دیکھ کے گھر گئے شوق میں شاد — لگا کہنے خوش ہو کے وہ خوش نہاد

بھرو شیر پادر سے الفت کے جام
مبارک مبارک خوشا وقت شام

وہ لڑکا جو پہنچا بہ نزدیک شہر — نظر آئی یاں اور ہی اہر بہر
دوکانوں پہ روشن سراسر چراغ — چراغوں نے گویا لگائے تھے باغ
جو ردلوں کہ نیچے دوکانوں پہ ہے — کچھ اس سے سوا بالاخانوں پہ ہے
دکھاتے جو ہیں روشنی دور سے — اڑی جاتی ہیں کھڑکیاں نور سے
تصاویر و نقشوں سے گلزار گھر — طرحدار کمرے ہوا دار گھر
کہیں مل کے بیٹھے ہیں کوٹھے پہ یار — کہے شعر خوانی ہے لگ رہے ستار
غزل ریختے کی سے ہے گا رہا کوئی — ہے گا رہا کوئی اور بجا رہا کوئی
لطیفوں پہ اڑتے ہیں جو قہقہے — کہاں یاد بلبل کو یہ چہچہے
غرض ہر جگہ سے گزرتا ہوا — تماشے خدائی کے کرتا ہوا
گیا جب کہ گھر میں وہ روشن چراغ — تو ماں باپ بھی ہو گئے باغ باغ
خوشی سے نہ جامے میں پھولے سمائے — بہن بھائی ملنے وہ آئے وہ آئے
سلام اس نے پہلے کیا باپ کو — جھکایا بہ حسن ادب آپ کو

دعا دی یہ اُس نے بھی لے کر سلام
مبارک مبارک خوشا وقت شام

بچھا صحن میں تھا بڑا سا جو تخت — وہاں آ کے بیٹھے وہ فرخندہ بخت
لگا سامنے آ کے دستار خواں — بہم کھا کھلا کر ہوئے شاد واں
فراغت ہوئی کھانے پینے سے جب — بچھونوں پہ آئے قرینے سے سب
برابر برابر بچھے تھے پلنگ — پڑیں چادریں ان پہ مہتاب رنگ
فلک نیلگوں رنگ نکھرے ہوئے — ستارے تمام اُن پہ بکھرے ہوئے
چمک کر چڑھا چرخ پر چاند تھا — کہ سُورج کا مُنہ کر دیا ماند تھا
اِدھر چاندنی نور پھیلا رہی — سیاہی اُدھر رنگ دکھلا رہی
وہ چھائی ہوئی رات تاروں بھری — کہ چادر ہو جیسے ستاروں بھری
پلنگڑی پہ لڑکا تھا لیٹا ہُوا — کہ بیٹا تھا شکر لپیٹا ہُوا
پدر تھا جو تاریخ کا راز داں — سُناتا تھا ہر دم نئی داستاں
کبھی کرتا خود شعر خوانی تھا وہ — کبھی سُنتا ماں سے کہانی تھا وہ
دیا یہ مزہ اُن حکایات نے — کہ انگڑائی گردوں پہ لی رات نے
ہوا آ کے پنکھا ہلانے لگی — ہر اک کو غرض نیند آنے لگی
تھکے ماندے دن بھر کے تھے ہو رہے — دوپٹے لئے تان اور سو رہے
بیاں کیا کروں رات کی شان کا — زمانے میں عالم وہ سنسان کا
پڑا نیند میں مست سارا جہاں — نہ تھے چور باقی نہ تھے پاسباں
پڑے سوتے سب ایسے مدہوش تھے — کہ گھڑیال تک بھی تو خاموش تھے

درختوں میں تھیں جو گذرتی ہوائیں — زمانہ پڑا کرتا تھا سائیں سائیں
بشبِ تار بھی نیند میں آن کر — سیہ چادر اپنی پڑی تان کر
ہمیشہ زمانے کا دستور ہے — اندھیرے سے کرتا عیاں نور ہے
کہ چمکا ستارہ سحرگاہ کا — ہوا رنگ پھیکا رُخِ ماہ کا
ستاروں کی آنکھیں جھپکنے لگیں — تعجب سے مشرق کو تکنے لگیں
شبِ تار کا رنگ فق ہو گیا — چراغِ سحر جاں بحق ہو گیا
ہوئی یک بیک روشنی سی نمود — اُبلنے لگا دیگِ مشرق سے دُود
سحر کے جو عالم نمودار تھے — دُھوئیں اُڑ رہے تھے شبِ تار کے
لگے بولنے سب سحر کے طیور — گئی اُن کی آواز نزدیک و دُور
وہ لڑکا جو تھا بسترِ خواب میں — ستارہ ہو جوں چادرِ آب میں

اُٹھا کر کہا اس نے تکیہ سے سر
سلامٌ علیکم مبارک سحر

جیسے چاہو سمجھ لو

قلم مرقعِ عبرت نیا دکھلاتا ہے — اور ایسے شخص کا ایک ماجرا سُنا

کہ سب تمہارا سا تھا کارخانہ اسکے لئے　　یہی زمیں تھی یہی تھا زمانہ اسکے لئے
فنا کے سایہ میں کرتا وہ زندگانی تھا　　جو پوچھو کون؟ تو سمجھو تمہیں سا فانی تھا
مٹا یا گردشِ گردوں نے آہ نام اُس کا　　نہ آج نام ہے اُسکا نہ کچھ مقام اُس کا

برا نہ سچ ہے کہ غمگین و شاد ہونے سے　　خوشی کے ہنسنے سے اور درد و غم کے رونے سے
کبھی امید سے اور گاہ نا امیدی سے　　کبھی خطر کی خبر گاہ خوش نویدی سے
جو ایک رنگ تھا آتا تو ایک جاتا تھا　　خیال اُس کا مرقع نیا بناتا تھا
یہ دل جو سینے میں جنبش ہے دمبدم کرتا　　کہ ہے اسی پہ ہر اک زندگی کا دم بھرتا

دماغ میں جو خیالوں کا آنا جانا ہے　　کوئی یقیں ہے کوئی وہم کا فسانہ ہے
ہمائے ہمّتِ عالی کا اوج پر جانا　　کبھی بہ جبر کبھی خود بخود اُتر آنا
غرض اُٹھانا یہ کیفیّتیں ضرور تھا وہ　　کہ آخرش یہی انسان با شعور تھا وہ

جو تم ہو دیکھ رہے وہ یہ سب ہے دیکھ چکا　　جہاں کے شام و سحر روز و شب ہے دیکھ چکا
جو کچھ کہ سہتے ہو تم آج سہہ چکا ہے وہ　　جو کچھ کہ آج ہو تم ایسا رہ چکا ہے وہ
مگر میں کیا کہوں مجھ کو تو اب یہ رونا ہے　　کہ جو وہ آج ہے اک دن وہ تم کو ہونا ہے

یہ روز و شب کہ مہ و سال کے حساب میں ہیں — یہ سال و ماہ جو موسم کے انقلاب میں ہیں
بہت سے میوے بہت سے اناج دیتے ہیں — بہار میں سر سبزہ کو تاج دیتے ہیں
یہ فرش خاک کہ سب کاروبار ہیں جس پر — یہ ابر و باد کہ سارے مدار ہیں جس پر
جب اسکے طوق گلو زندگی کا قصہ تھا — تو ساری محنتوں سے لیتا اپنا حصہ تھا
یہ سب کچھ اب بھی ہے پر اسکی کچھ خبر بھی نہیں — جو ہو تو نفع نہیں گر نہ ہو ضرر بھی نہیں
بلا سے اس کی زمانہ ابھی فنا ہو جائے — دعا کہ ملک فنا گلشن بقا ہو جائے
وہ آپ ہی جب نہ ہوا پھر جہاں ہوا نہ ہوا — زمیں ہوئی نہ ہوئی آسماں ہوا نہ ہوا

یہ صبح و شام جو ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں — یہ سال و ماہ کی فصلیں جو آتی جاتی ہیں
یہ مہر و ماہ کہ جن سے جہان روشن ہے — ستارے جن سے زمیں آسماں روشن ہے
کسی میں بھی دور کا اسکے نشاں نہیں باقی — پتا فلک بھی تہ آسماں نہیں باقی
قضا نے لے کے الٰہی کہاں چھپایا اسے — زمین کھا گئی یا آسماں نے کھایا اسے

کسی کے حسن پریوش کا وہ دوانہ تھا — اور اس کے تیر ادا کا ہوا نشانہ تھا
پر اب جو دیکھو تو وہ غیرت پری بھی نہیں — وہ اسکے ناز وہ انداز دلبری بھی نہیں
فنا کی بزم میں ساقی نے اسکو جام دیا — مرض کا نام کیا موت کا پیام دیا
طبیب آئے تھے لیکن کوئی دوا نہ چلی — خود آیا حسن سفارش کو پر ذرا نہ چلی

فلک نے موت کا جام آخرش پلایا اُسے ۔ دہانِ گور سے گویا زمیں نے کھایا اُسے

ازل کی صبح کہ جس میں جہاں ہوا پیدا ۔ اور اس کے ساتھ ہی گویا ہوئی تنا...
کتاب عمر جہاں آجتک پڑھی ہیں نے ۔ ورق ورق ہے یہ تاریخ دیکھ لی ہیں...
ہر ایک راز ہے اس میں کہیں نہیں کھلتا ۔ پر اس غریب کا احوال کچھ نہیں کھلـ...

بہت ہوں فکر سے کہتا کہ کچھ بتا تو سہی
ہے وہ بھی اتنا ہی کہتا کہ کوئی تھا تو سہی

جغرافیہ طبعی کی پہیلی

جو منشی ذکاء اللہ صاحب پروفیسر یا ہمارے مشرقی کی فرمایش سے نظم کی گیی

ہنگامہ ہستی کو ۔ گر غور سے دیکھو تم
ہر خشک و تر عالم ۔ صنعت کے تلاطم ہیں

جو خاک کا ذرّہ ہے یا پانی کا قطرہ ہے
حکمت کا مرقع ہے جس پر قلم قدرت
انداز سے ہے جاری اور کرتا ہے گلکاری
اِک رنگ کہ آتا ہے سو رنگ دکھاتا ہے

اور دیکھنے والوں کی آنکھیں تو کھلی ہیں پر
خرمہرۂ رنگیں ۔ یا بلّور کے ٹکڑے ہیں
ہر لحظہ و ہر ساعت قدرت کے تماشے ہیں
عالم میں پڑے ہوتے پر اُن کو نہیں پروا
ہرگز کہ یہ سب کیا ہے اور ہے تو سبب کیا ہے

ایسے بھی مگر اکثر ارباب بصیرت ہیں
جو کھولے ہوئے ہر دم ہیں دیدۂ عبرت کو
ذرّہ ہو کہ ہو سورج معنی ہو کہ ہو صورت
ہر جلوۂ قدرت میں سرمہ انہیں حکمت کا
سرمایۂ بینائی اور عینک عبرت ہے
یہ آنکھ پہ ٹھیک آئی جس سے کہ زمانہ کی

گرمی ہو ، یا سردی   یا ہووے تری خشکی
حکمت کا معمّا ہے   قدرت کی پہیلی ہے
نقطہ ہے اگر اس میں   ہے عقدۂ سربستہ
عقدہ ہے اگر اس میں   ہے نکتۂ برجستہ
اک سیدھی سی بات اسوقت   آئی ہے تصوّر میں
آپس میں جو رکھتی ہیں   پیوند زنا شوئی
اولاد سے جن کی سب   آباد زمانہ ہے
نقلی نہیں افسانہ   سب نے اسے مانا ہے
اور پھر انہیں دونو کو   دیکھو جو نظر بھر کر
ماں بیٹی کا ہے ناتا   دونو میں نظر آتا
شورشگۂ عالم میں   پیدائشیں لاکھوں ہیں
اصلوں کی بہت نسلیں   رشتوں کے سررشتے ہیں
اس پیچ کا پر رشتہ   دیکھا نہ سنا کوئی

آزاد - بھلا ہے کون   جو آگے ترے بولے
یا بند گرہ کھولے   ہاں یہ کہ مگر تو ہی
کہہ سن کے سوال اپنا   دے آپ جواب اپنا

وہ دو کہ بہم جن میں | ہے عقدِ زن و شوہر
عالم میں ہیں دو جوہر | خشکی و تری جن سے
صنعت گرِ قدرت میں | پیدا و ہویدا ہیں
سب عالمِ جسمانی | حیوانی و انسانی

اور دوسرے رشتہ سے | گر غور کرو دل میں
تو دیکھ لو پانی کو | جس رنگ میں جی چاہے
بادل ہو کہ ہو باراں | قطرہ ہو یا ہو دریا
شبنم سے بھی کم ہووے | یا نام کو نم ہووے
اک عرصۂ خاص اس پر | گزرے گا تو دیکھو گے
خشکی کے نشاں ہوتے | اس میں سے ہویدا ہیں
یا بچے ہیں جو ماں کے | آغوش میں پیدا ہیں

کیوں قبلۂ من دیکھا | یہ طرفہ معمّا ہے
کیا بوجھے کوئی پنڈت | یا فلسفی و دانا
ہاں سمجھیں میاں آزاد | یا منشی ذکاء اللہ
سنبل ہے یہ سبزہ میں | پھولوں میں چنبیلی ہے

کون اس کو بھلا بوجھے
حکمت کی پہیلی ہے

مبارکباد جشن جوبلی

اے خوشی آ تیرے آنے سے زمانہ روشن
آ کہ تو آپ ہے روشن - ترا آنا روشن

اے خوشی آ ترے آنے سے ہے گھر گھر شادی
ہے ترے آنے سے ہر لب پہ مبارکبادی

یاد میں بیٹھے تھے یاران دل آگاہ تری
سالہا سال سے تھے دیکھ رہے راہ تری

ہم خوشی اسکو نہیں کہتے جو ہر سال آئے
خلقت عید میں ہنستی ہوئی خوشحال آئے

کبھی عید رمضاں ہو کبھی عید قرباں
ہاتھ پھیلائے گلے ملتے ہیں بڈھے بچے جواں

عیدیاں بانٹ کے بچوں کے جو دل شاد کرے
ہول و ہنگامہ سے بازاروں کو آباد کرے

خوشی اسکو بھی نہیں کہتے جو نوروز سے ہو
گل و گلشن کے لئے جشن دل افروز سے ہو

سبزہ و گل میں عیاں عالم نیرنگ کرے
خاک کو سبزہ کرے سبزے کو گلرنگ کرے

ڈشی کیا کہ ہو رُخ جس کا فروزاں شب کو — اور دوالی سے کرے جشن چراغاں شب کو
بجا ساتھ کھلونوں کے مٹھائی بانٹے — کہیں آنہ کہیں پیسہ کہیں پائی بانٹے
یا اسکو نہیں کہتے کہ کرے نام سے خوش — امتحاں لے کے کرے بچوں کو انعام سے خوش

ڈشی کیا کہ جو گھر بیٹھ کے ہم آپ کریں — ہر برس سالگرہ بچوں کی ماں باپ کریں

ہے حقیقت میں خوشی وہ کہ بہ افضال خدا — ہند پر قیصرۂ الف ہوں فرماں فرما
جب بہ اقبال و حشم گذریں اسے سال پچاس — جا بجا جشن خداساز کے ہوویں اجلاس
ہوئے لاہور میں دربار نشاط و شادی — اور پڑھے آن کے آزاد مبارکبادی

خوشی وہ ہے کہ دل جس سے ہیں خنداں خنداں — یہ خوشی وہ ہے کہ ہو عید بھی قرباں قرباں
ہے خوشی عام دلوں کے لئے اور جاں کے لئے — یہ خوشی عام ہے ہندو و مسلماں کے لئے
تے ہیں بندہ بے دام و درم حاضر ہیں — اور اگر جان کا موقع ہو تو دم حاضر ہیں
وہ بیچارے تھے جو ادبار کے مارے پھرتے — اور سعادت پہ تھے انکے ستارے پھرتے
سرپرست انکا زمانے میں نہیں کوئی رہا — حال باقی نہیں کچھ انکا فسانے ہیں رہا
سابرس پرورش عام جو مبذول ہوئی — واسطے انکے بھی تدبیر ہے معقول ہوئی

[illegible] — [illegible] کی [illegible]
[illegible] — [illegible] ہندو مسلمان خوش ہیں

[illegible] — دن کو پھرتے ہیں تو شکرانہ ادا کرتے ہیں
[illegible] — [illegible] کی ہو عمر دراز
[illegible] — ان کی اولاد سے آبادیاں آباد رہیں

[illegible] مبارک کا سدا دور رہے
[illegible] دولت سب کی [illegible] رہے

ایک [illegible]ے کا عاشق

اک [illegible] کسی [illegible] تھا — اسکے دیدار کا دلدادہ و شیدائی تھا
[illegible] — اور یہی رات دن آنکھوں میں سمایا ہوا تھا
[illegible] — چشم حیرت میں نظارے کا سہارا تھا اسے
[illegible]

اپنے ستارے پہ تھا وارا کرتا
[illegible] اس سے ادا کرتا تھا

غم جو اک شب اُسے بیتاب و تواں کرنے لگا ۔ منہ ہی منہ میں یہ سخن اس سے بیاں کرنے لگا
ہے تو تو رشکِ پری غیرتِ صد حور ہے تو ۔ مگر اس عاشقِ دلدادہ سے کیوں دور ہے تو
منہ ترا مہر صفت ہے جو دمکتا پیارے ۔ سرد مہری سے مگر کیوں ہے جھمکتا پیارے
اے وہ تو جس پہ کہ قابو کی کوئی بات نہیں ۔ چشمِ حسرت کے سوا حرف و حکایات نہیں
ہیں جو ارمان بھرے دل میں نکالوں کیونکر ۔ ہائے چھاتی سے تجھے اپنی لگاؤں کیونکر
دم نکل جائے تو ہو بار مبارک مرنا ۔ یوں جو مرنا تو ہو سو بار مبارک مرنا
اپنے تارے کو جو حسرت سے یہ تکتا تھا پڑا ۔ جامِ دل جوشِ محبت سے چھلکتا تھا پڑا
آدمیت اُسے تب اُسکے خیالات نے دی ۔ دفعتہً جنبش ادھر شوقِ ملاقات نے دی
بن کے عورت کششِ عشق کی ماری آئی ۔ آسماں چھوڑ زمیں پہ وہ بچاری آئی
بولی پھر اس سے کہ اے شاعرِ شیدا میرے ۔ شوقِ دیدار تھے دل میں ترے کیا کیا میرے
کششِ شوق نے تیری مجھے بلوا ہی لیا ۔ تو وہ عاشق ہے کہ آخر کو مجھے پا ہی لیا
یہ تو مثلاً کسی عورت کی ہے چھاتی اچھی ۔ یا کرن تارے کی شب کو نظر آتی اچھی
سنی شاعر نے جو یہ بات تو شرمایا بہت ۔ بلکہ شرمایا نہیں جتنا کہ پچھتایا بہت
بولا افسوس وہ تارا جو اڑاتا تھا مجھے ۔ اوجِ افلاک پہ کھینچے لئے جاتا تھا مجھے
آج وہ نورِ فلک ہاتھ سے کھویا میں نے ۔ بولی وہ اپنا بھی کام آج ڈبویا میں نے
تو نے گردوں پہ چمکتا ہوا تارا کھویا۔

محنت کرو

ہے امتحاں سر پر کھڑا محنت کرو محنت کرو
باندھو کمر بیٹھے ہو کیا محنت کرو محنت کرو

بیشک پڑھا باقی ہے سوا اور یہ تھکا ہارا ہوا
ہے ابھی مشکل بابا محنت کرو محنت کرو

شکوے شکایت ہیں ہنستے ہیں ہم نے سنے
جو کچھ ہوا اچھا ہوا محنت کرو محنت کرو

محنت کرو انعام لو انعام پر اکرام لو
جو چاہو گے مل جائے گا محنت کرو محنت کرو

بیٹھ جاتیں ہار کر کہہ دو انہیں انکار کر
ہمت کا کوڑا مار کر محنت کرو محنت کرو

تدبیریں ساری کر چکے باتوں کے دریا بہہ چکے
اب ایک ہے اب کیا فائدہ محنت کرو محنت کرو

ہے بیج اگر ڈالو گے تم دل سے اُسے پالو گے تم
دیکھو گے پھر اس کا مزا محنت کرو محنت کرو

محنت جو کی جی توڑ کر ہر شوق سے منہ موڑ کر
کر دو گے دم میں فیصلہ محنت کرو محنت کرو

کھیتی ہری یا سوداگری ہو بھیک یا ہو چاکری
سب کا سبق یکساں بنا محنت کرو محنت کرو

جس دن بیٹھے تم ہو گئے دنیا کے دھندوں میں پھنسے
پڑھنے کی پھر فرصت کہاں محنت کرو محنت کرو

بچپن میں ہم کس کا سدا انجام کو سوچو ذرا
بڑے ہو کر کھاؤ گے کیا محنت کرو محنت کرو

نظم مرصع

اقبال اک برس جو مرا تاج سر ہوا — شملے پہ مجھ کو موسم سرما بسر ہوا
جاڑے کے مارے چلتے ہوئے پانی تھم گئے — اور جو تھمے ہوئے تھے وہ بن بن کے جم گئے
دامان کوہسار میں سورج بھی لپٹ کر — دبکا لحاف ابر میں منہ کو لپیٹ کر
دیکھو جو گھر تو سب در و دیوار تھے سپید — باہر چلو تو دامن کہسار تھے سفید
پتے بھی آکے جاڑے نے سب دور کر دیئے — اور تھے درخت برف نے بلور کر دیئے
اک رات بیٹھے بیٹھے جو میں تنگ آگیا — گھر سے نکل کے آگے ٹہلتا چلا گیا
دیکھا کہ دوڑا جاتا ہے اک تازہ نوجواں — ہمت کے ہاتھ میں ہے اٹھائے ہوئے نشاں

ہے اس پہ روشنی سے لکھا ہاں بڑھے چلو

ہمت کا اسکی حال میں لکھ کر سناؤں کیا — [illegible]
جاتا تھا نوجوان عجب آن بان سے — پیدا شکوہ و شان [illegible] نشان سے
چلتا قدم اٹھائے تھا اور سر جھکائے تھا — گویا خروش و جوش کو دل میں دبائے تھا
کیا جانے فکرمند تھا یا کیا ملال تھا — تیور بگڑ رہے تھے کچھ ایسا خیال تھا
سینے میں نعرہ بند تھا منہ میں نہ تھی صدا — لیکن خموشی اس کی یہ آواز کرتی تھی

نکلتی تھی ہر قدم پہ صدا ہاں بڑھے چلو

وہ آگے آگے جاتا تھا میں ساتھ ساتھ تھا — دامن تھا اسکے شوق کا اور میرا ہاتھ تھا

جو آکے خود سیاہیِ شب راہ پر پڑی — آبادی ایک شہر کی ہم کو نظر پڑی

خوشحال گھر اور اُن میں خوشی بولتی ہوئی — باتیں کہ غم سے دل کی گرہ کھولتی ہوئی

گھر گھر اُجالے تھے سرِ دیوار سامنے — دروازوں سے چراغ نمودار سامنے

تھے ہر طرف سے جاڑے کے سامان پکارتے — تارے بھی اک کنارے سے تھے آنکھ مارتے

آرام کہہ رہا تھا کہ آگے نہ جا نہ جا — اور میں بھی کہہ رہا تھا کہ سچ سچ بجا بجا

سمجھانے والے سب یونہی سمجھا کے رہ گئے — اتنا بھی وہ نہ سمجھا کہ ہیں کیا یہ کہہ رہے

چپکے سے گر کہا تو کہا ہاں بڑھے چلو

پھیرا تھا منہ ابھی نہ شبِ تیرہ فام نے — اِک پیر مرد تجربہ کار آیا سامنے

پیری کی برف نے تھا اُسے تن بدن دیا — موئے سپید نے نمدی پیرہن دیا

بولا کہ اے جوان عجب کالی رات ہے — اور وقت وہ کہ رات ہے یا حق کی ذات ہے

سنسان جنگل اور درختوں کی سائیں سائیں — چاروں طرف پہاڑ ہیں ہیں دوڑتی بلائیں

طوفان برف سر پہ کھڑا ہے تُلا ہُوا — ہے یہ درہ کہ موت کا مُنہ ہے کھلا ہوا

مانا کہ لطف عیش و طرب پر نظر نہیں — جانا کہاں ہے موت کا بھی تجھ کو ڈر نہیں

یہ سن کے نکلا شعلہ دل نوجوان سے — گویا ستارہ ٹوٹ پڑا آسمان سے

اور اس نے دی کڑک کے صدا ہاں بڑھے چلو

تھی رات رنگ ابھی رُخ عالم پہ پھیرتی — گہ مشک اُڑاتی تھی گہے عنبر بکھیرتی

کیا جانے ہم نکل کے کدھر کے کدھر گئے — دیکھا کہ جاڑے زور سے اپنے اتر گئے
موسم بھی معتدل ہے ہوا ہے لہک گئی — خوشبو کا ہے یہ حال کہ دنیا مہک گئی
اور جانور ہیں رات کے آوازیں دے رہے — بل کھل کے ساتھ جیسے ہوں مساز دے رہے
پانی کی ہیں پہاڑ سے آوازیں آ رہیں — جو زیر و بم کے دور سے ہیں سر ملا رہیں
ناگاہ آ گئی ایک پری زاد سامنے — کی رمز گل سے بلبل رنگیں کلام نے
جاتے ہو ایسے وقت میں کس کام کے لئے — آرام کیجیے رات ہے آرام کے لئے
دیکھا پری کو اس نے مگر چشم ناز سے — اور پاس ہو کے نکلا عجب سوز و ساز سے

پھر اتنا مسکرا کے کہا ہاں بڑھے چلو

ناگہ فلک پہ دامن شب چاک ہو گیا — لبریز نور سے طبق خاک
منہ رات کا جو صبح کے آنے سے فق ہوا — گلگونہ لے کے سامنے رنگ شفق ہوا!
روئے سحر پہ شان تھی نور و ظہور کی — چاروں طرف وہ زمزمہ خوانی طیور کی
وہ گہری سبزیوں میں گل تر کی لالیاں — اور اوس سے بھری ہوئی پھولوں کی پیالیاں
وہ صبح کی ہوا سے درختوں کا جھومنا — اور جھوم جھوم کر وہ رخ گل کا چومنا
سبزی جو دوب نے خاک پہ مخمل بچھا گئی — شبنم بھی آ کے رات کو موتی لٹا گئی
پانی وہ صاف صاف جو بل کھا کے جاتے تھے — پالے کے سانپ گھاس پہ لہرا کے جاتے تھے
سورج نے سر نکالا کیا ایک پہاڑ پر — بولا جوان شیر کی صورت دہاڑ کر

آرام کی نہیں ہے یہ جا ہاں بڑھے چلو

تبدیل جب کہ ہو گئے رنگ سپہر ہوا — اک مدرسے کے آگے سے اپنا گذر ہوا
تھا پاس اک خرابۂ مسجد پڑا ہوا — مُلّا تھا اس میں بر سر منبر چڑھا ہوا
تھا ہر طرف کو دامن تقریر کھینچتا — اور دوزخ و بہشت کی تصویر کھینچتا
جو دو تصویر پر تھا دلوں کو لبھا رہا — دوزخ دکھا کے خلق خدا کو ڈرا رہا
سنتے لوگ اسکی باتوں پہ مدہوش ہو رہے — اور معتقد تھے سب ہمہ تن گوش ہو رہے
دیکھا جو نوجوان کو اس مرد پیر نے — اپنی لکیر پیٹی پرانے فقیر نے
یعنی کہ آؤ خلد کا نقشہ دکھائیں ہم — بیٹھو کہ تم کو عرش کے اوپر اڑائیں ہم
بولا جوان کہ اب وہ زمانے گذر گئے — وہ رات ہو چکی وہ فسانے گذر گئے

اور سب سے پھر اشارہ کیا ہاں بڑھے چلو

ملک فنا اگرچہ بہت بے ثبات ہے — بے پا و بے مدار ہے جو اسکی بات ہے
لیکن بجا کہا جو کسی نے کہا ہے یہ — ہمت کے معرکوں کے لئے تو یہ چاہیے یہ
پر دیکھتا جو ہوں تو یہاں طرفہ حال ہے — مطلق ادھر نہیں کوئی کرتا خیال ہے
دن رات ہے امیروں کو آرام سے غرض — ساقی سے مدعا ہے و یا جام سے غرض
باقی فلاکتوں کا تو پھر کیا ٹھکانا ہے — افلاس انکے واسطے پہلا بہانہ ہے
اور جو کہ رکھتے ہمت و غیرت سے کام ہیں — محنت سے پیٹ پالتے ہیں صبح و شام ہیں
لڑکے وظیفوں پر ہیں سبق یاد کر رہے — تنخواہوں پر ہیں محنتیں استاد کر رہے
پھرتے فقیر مانگتے در در ہیں صبح و شام — کہتے ہیں بار بار کہ دے جا خدا کے نام

آزاد کی یہی ہے صدا ہاں بڑھے چلو

نظم اُردو

۹ مئی ۱۸۷۴ء کو نظم اُردو کے عالم میں ایک انقلاب ہوا۔ کہ
بان کی تاریخ میں عمدہ یادگار سمجھا جائیگا۔ نظم مذکور کی آگ ایک چقماق
سے نکلی تھی جس کا ایک پُرزہ شعرائے آتش بیاں کی طبع روشن تھی دوسرا
پُرزہ اُمرائے زندہ دل کی گرم طبیعت۔ ایک کی شوخی نے غزل اور قصیدہ کو
دلالت دی اور دوسرے کی قدردانی نے اُسے پال کر پرورش کیا۔
مخلوق مذکور اسی حال میں بڑھیا ہو کر اپنی حد سے گذر گئی۔ مختصر یہ کہ وہی
معمولی مضمون تھے جو پہلے اُستادوں نے نکالے تھے۔ موجودہ شاعر
چباتے ہوئے نوالوں کی طرح انہیں لیتے تھے۔ اور الفاظ ادل بدل کرتے
تھے اور پڑھ پڑھ کر آپس میں خوش ہوتے تھے۔ صاحب ڈائرکٹر بہادر نے
سال مذکور میں میرے اُستاد پروفیسر آزاد کو ایما فرمایا۔ اُنہوں نے اس
مطلب پر مناسب وقت ایک لکچر لکھا اور شام کی آمد اور رات کی کیفیت
ایک مثنوی میں دکھائی۔ حضور ممدوح کی تجویز سے ایک تاریخ مقرر ہوئی۔